Al3
409

تین غنڈے

تین غنڈے

کرشن چندر

نیا ادارہ — لاہور

طبع اوّل قیمت عہ

(میاں محمد حنیف نے کراؤن پریس سے چھپوا کر اردو اکیڈمی پنجاب لاہور سے شائع کی)

ترتیب

پال

"پال!"

"یس ڈارلنگ!"

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ میں تمہاری ڈارلنگ نہیں ہوں۔"

"تم ہو۔ میں نے جب کہہ دیا بس۔ کیا تمہیں یقین نہیں آتا۔"

"میں یہ پہلے بھی سُن چکی ہوں۔"

"میں یہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ کتنی بار۔ پیرس میں۔"

"بڑے سؤر ہو تم۔"

"نہیں۔ میں سؤر نہیں ہوں۔ میں آرین ہوں۔ تم بھی آرین ہو۔ ہم

پال

دونوں آرین نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں فرانسیسی ہوں۔ تم انگریز ہو۔ یہ ہندوستان ہے، اور ہم دونوں آرین نسل کے افراد اس جنگل میں، اس صحرا میں، اس ویرانے میں، اس سمندر میں اکیلے ہیں۔ ایک جزیرے کی طرح۔ بتاؤ ہم کیوں محبت نہ کریں ڈورتھی...... ڈورتھی تمہارا نام عجیب سا ہے ڈورتھی مجھے پسند نہیں ہے تمہارا نام ہونا چاہیئے تھا۔ لی زل، ازابیلا، روز، واَنتا ہاں بس واَنتا ٹھیک ہے۔ پیارا نام ہے، شرابی نام ہے مغربی فرانس کی بیلوں کی طرح لطافت ہے اس میں۔ وہ کیف، وہ بہار، وہ رعنائی.... واَنتا.....!"

"بڑی عجیب باتیں کرتے ہو تم بڑی پیاری باتیں....."

"تمہیں پسند ہیں نا یہ باتیں۔ سبھی عورتیں مجھ سے یہی کہتی ہیں۔"

"سبھی عورتیں؟..... تو کیا تم ــــ ہٹو، مجھے جانے دو۔ میں تمہارے ساتھ کھانا نہیں کھاؤں گی۔"

"نہیں بیٹھو، انگریزی قوم بھی سچ مچ کس قدر عجیب ہے۔ محبت کے نام سے بدکتی ہے۔ محبت فرانسیسی کلچر کی جان ہے، اب اگر تمہاری جگہ کوئی فرانسیسی میڈموزیل ہوتی۔ تو جانتی ہو کیا کہتی..... اچھا جانے دو بیٹھو

یہ ہندوستان ہے۔ اور ہم دونوں اکیلے ہیں۔ اور آج کی رات ہماری ہے۔"

"آج کی رات؟ احمق، تم مجھے گھر پر پہنچا کے آؤ گے نا۔ پاپا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"شش..... پاپا کا نام نہ لو، آج کی رات ہماری ہے۔ یہ چینی رستوران ہے۔ چینی کھانا ہندوستان میں، اور ہندوستانی کھانا چین میں، مَیں جب ہُنگ کنگ تھا۔ تو ایک ہندوستانی رستوران میں کھانا کھانے جایا کرتا تھا۔ کیا نام تھا اُس کا۔ انڈیا کافے..... انڈیا کافے..... ہائے فرانسیسی کافے یاد آتے ہیں۔ ہر روز۔ بار بار۔ ہر لمحے یاد آتے ہیں۔ یہ بھی کوئی کافے ہیں، نہ وہ نفاست ہے۔ نہ وہ نازکی، نہ وہ گفتار کا لہجہ۔ اپنی پیاری میٹھی زبان کو سننے کے لئے ترستا ہوں۔ معاف کرنا، تمہاری انگریزی تو اس طرح بولی جاتی ہے جس طرح پتھریلی سڑک پر رولر چل رہا ہو۔"

"شٹ اپ"

"سچ کہتا ہوں۔ اور سچ کو ہمیشہ شٹ اپ کہا جاتا ہے، ڈورتھی، مجھے تم سے عشق ہے۔ مجھے فرانس سے عشق ہے لیکن آج ہم دونوں اکیلے ہیں۔ بیرہ! یہ کھانا یہاں نیچے رکھ دو۔ نہیں اس میز پر نہ رکھو، کھانا پھر

کھائیں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی۔ لیکن محبت نہیں رُک سکتی۔ اک لمحے کے لئے نہیں۔ گھبراتی کیوں ہو۔ یہ بیرہ اتنی انگریزی نہیں سمجھتا۔"

"فرض کرلو کہ یہ سمجھتا ہے تو۔"

"تو بھی کیا پرواہ ہے۔ ہر روز یہ اس ٹیبل پر اسی قسم کی گفتگو سنتا ہے غالباً......"

"تم تو بڑے غنڈے ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے ساتھ یہاں رستوران میں چلی آئی۔

تم یہ بات دل سے نہیں کہہ رہی ہو۔ یہ جھوٹ ہے۔ مگر ہے دلفریب دھوکا ہے۔ میں اُسے خوب پہچانتا ہوں سُنو ڈورتھی۔ میں تمہیں وانا کہونگا تمہیں کوئی اعتراض ہے۔ تمہاری آنکھیں کہے دیتی ہیں۔ تمہیں کوئی اعتراض نہیں ڈورتھی تو کوبجروں کا نام ہوتا ہے نا۔ سُنو وانا۔ تم بہت خوبصورت ہو اس سے پہلے بھی تمہیں کئی انگریز مردوں نے یہ بتایا ہوگا۔ پر آج ایک فرانسیسی کی زبان سے سن لو تمہارا حسن بالکل نیا ہے۔ اس میں کنوار پتے کی تازگی ہے۔ مجھے تمہاری آنکھیں بہت پسند ہیں۔ بالکل منزل، اور ان شفاف پتلیوں کی گہرائیاں، اور یہ دل بازنگت، جیسے زیتون میں شہد ملا ہو۔ اور یہ بال، بلانڈ۔ صحرائی ریت کی

طرح تابناک، آہا ہا کیسی اچھی خوشبو آرہی ہے ان میں سے . . . "

"ہٹو۔ مجھے نہ چھوؤ۔"

"کیسی اچھی خوشبو آرہی ہے ان میں سے۔ اچھی۔ پیاری۔ ہلکی نمکین جیسے بحرِ شمالی کی ہواؤں کی تازگی اور خنکی ان میں رچی ہوئی ہے آہ —— اے انگریز عورت۔ تو نے کبھی کسی فرانسیسی سے محبت کی ہے۔ نہیں؟ تو تو نے زندگی میں محبت کی معراج کھو دی ہے۔ مجھ سے عشق کر۔"

"سچ مچ بڑے باتونی ہو۔ شاید اسی لئے مجھے کچھ کچھ پسند ہو۔"

"ہاں اب آئیں راہِ راست پر۔ ہر عورت پہلے بھٹک جاتی ہے پھر راہِ راست پر آجاتی ہے، کم از کم میرا تجربہ تو یہی کہتا ہے۔"

تمہارا تجربہ؟ اُف۔ کس قدر بے حیا ہو تم۔"

سچی بات کہتا ہوں۔ اُس ملک کا بیٹا ہوں جس نے انقلاب کی پہلی موج کو جنم دیا۔ سچی بات کہتا ہوں۔ وآنا، تم مجھے پسند کرتی ہو۔ میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ اور ہم دونوں اکیلے ہیں۔ اور یہ ہندوستان ہے اور آج جنگ ہے۔ اور موت کا طبل بج رہا ہے۔ ہو سکتا ہے میں کل مر جاؤں، تم پُونا سے تبدیل ہو کر اسکندر آباد چلی جاؤ یا مونگھیر، یا کوئی اسی قسم

کا ذلیل مقام، پھر آج یہ جو اتفاق سے ہم تم دونوں اکٹھے ہوئے ہیں۔ پھر کب مل سکیں گے۔ میں اسے معجزہ نہیں کہتا۔ اتفاق کہتا ہوں۔ لاکھوں لاکھوں لاکھوں لاکھوں گردشوں کے درمیان دو ذرّے ٹکرا گئے۔ میں اور تم ..... آؤ اس لمحے کو مکمل کر لیں۔ میں پونا ہوٹل میں رہتا ہوں۔ میرے پاس ایک کمرہ ہے۔ اور چاروں طرف خاموشی ہے۔ زندگی سو رہی ہے۔ کھڑکی میں گلاب کی بیلیں ہیں۔ دو بڑے بڑے پھول، دو پاکیزہ آنسوؤں کی طرح تمہارے بالوں میں جگمگائے نظر آئیں گے۔ آہ ڈارلنگ!"

"بھئی مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔"

"تو آؤ کھانا کھائیں۔ مادّی باتوں کا ذکر کرو گی۔ انگریز عورت جو ٹھیریں فرانسیسی ہمیشہ محبت کو ترجیح دیتا ہے، انگریز کھانے کو۔ معاف کرنا ڈارلنگ یہ مادیت تمہارے سامراج کی بنیاد ہے جس میں ہندوستان بھی شامل ہے۔ کہو اس ملک کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔"

"میں نے دیکھا ہی نہیں اسے ابھی تک مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ — کہ اس میں بدبو بہت ہے۔"

"بدبُو؟ شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہ ملک بدبوؤں سے بھرا ہوا ہے

آئینہ، یہ لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی، یہ صوفے جواب نہ یورپی ہیں۔ نہ ایشیائی، یہ کونسی تہذیب ہے۔ کونسا کلچر ہے، کس مسرت کی آئینہ داری کرتی ہے۔ ذرا بتا دو۔ ہم تم اس کمرے میں بیٹھے ہیں۔ اس کمرے کی شخصیت کیا ہے؟"

"شش سنبھل کر بات کرو۔ ہوش میں آؤ پال۔ یہ کمرہ اختر کی محبوبہ کا ہے؟"

"اختر کی محبوبہ کا ہے؟ ہائے غریبی۔ معاف کرنا شاعر۔ تم شاعر ہو۔ تمہارا دل شاعر کا ہے گا لیکن اس کمرے کی روح اس قدر غریب کیوں ہے، یہ ویران دیواریں، یہ ننگے آئینے، یہ بے ڈول صوفے . . . . ."

"کرایہ پر اٹھا لایا ہوں . . . . ."

محبت کرائے سے نہیں خریدی جاتی، یہ محبت نہیں ہے حیوانیت ہے، جانتے ہو اگر یہ کمرہ میری محبوبہ کا ہوتا تو میں کیا کرتا۔ میں اس کمرے کی ہر دیوار کو چنبیلی کے پھولوں سے ڈھانپ دیتا چنبیلی کے نازک پھول جیسے فرانس کی کنواری . . . . . یاسمن . . . . . تمہارے ملک میں یاسمن کی اس قدر بہتات ہے۔ اور پھر بھی یہ دیواریں ننگی ہیں۔ یہ آئینہ ننگا ہے۔ یہاں پر کوئی

دیوان نہیں۔ کوئی غالیچہ نہیں۔ ہوا میں تعطر نہیں۔ برآمدے میں پھولوں کی بیلیں نہیں۔ دروازوں پہ چنبیلی کے پردے کیوں نہیں۔ یہ لوہے کی سلاخیں یہاں کیا کر رہی ہیں۔ یہ تمہارے محبوب کا کمرہ ہے یا جیل خانہ پیارے اختر۔ شاعر۔ بتاؤ۔ تم کس کلچر کی اولاد ہو۔ تم کیا تھے۔ کیا ہو گئے۔ کدھر جا رہے ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بس یہ جانتا ہوں۔ تم اپنے افلاس۔ اپنی اپنی غلامی، اپنی مصیبتوں کے خود ذمہ دار ہو۔ معاف کرنا۔ میں سامراج کا حامی نہیں۔ میں ڈیموکریسی کا سپاہی ہوں۔ کیا تم مجھ میں کسی قسم کی مغائرت کی جھلک دیکھتے ہو۔"

"نہیں۔"

"تو بس جو میں کہتا ہوں اسے ٹھیک سمجھو۔ ہا ہا ہا! چائے پلاؤ گے۔"

"ضرور۔ . . . مگر ایک بات کہوں پال۔ تم جب بات کرتے ہو۔ تو تمہارا نچلا ہونٹ بڑے عجیب انداز میں آگے کو پھیل جاتا ہے — موریس شولیئیر کی طرح۔"

"ہر فرانسیسی میری طرح دلکش انداز میں اسی دلکش انداز میں باتیں کرتا ہے۔ یہ ہماری قومی خصلت ہے۔ چارلس بویاں کو فلموں میں کام کرتے

دیکھا ہوگا۔ آہ چارلس بویاں فرانسیسی اندازِ محبت کی تفسیر ہے۔ انگریز جب عشق کرتا ہے۔ تو کہتا ہے "میں تم سے محبت کرتا ہوں" کس قدر پوچ انداز ہے یہ "میں تم سے محبت کرتا ہوں" "تم کس قدر حسین ہو" یہ عاشق کی زبان نہیں ہے۔ بیکری کے مستری کی زبان ہے۔ جب فرانسیسی عشق کرتا ہے۔ تو خوشبوؤں کی زبان میں اپنے مطالب کا اظہار کرتا ہے۔ یاسمن..... یاسمن..... "اختر۔ اس کمرے کو چنبیلی کے پھولوں سے رشکِ گلزار بنا دو۔ تاکہ جب تمہاری محبوبہ اٹھلاتی ہوئی اس کمرے میں داخل ہو تو تم آنکھوں کی زبان میں خوشبوؤں کے سانسوں میں اُس سے اظہارِ محبت کرسکو"

پال۔ میں چارلس بویاں کا وہ فقرہ کبھی نہیں بھولتا جو اُس نے اپنی محبوبہ کی تعریف میں کہا تھا۔ ایک سادہ سا فقرہ ہے۔ لیکن اس سے بہتر جملہ محبت کی زبان میں آج تک ادا نہیں ہوا۔ اس نے اپنی محبوبہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔ تم ـــ تم میری محبوبہ نہیں ہو۔ تم پیرس ہو"

"پیرس..... پری..... پری..... ہائے..... ہائے..... اس جملے پر سو جان سے نثار ہوں..... اختر تم اپنی محبوبہ سے کیا کہتے ہو بھلا؟"

"میں؟ ــ میں تو کچھ بھی نہیں کہتا۔ بس خاموش بیٹھا اُسے تکتا رہتا ہوں۔"

"یہ ایشیا کی زبان ہے۔ محرومیت کی زبان ہے۔ غریب غلام اور گھٹے ہوئے لوگوں کی زبان ہے۔ پیارے محبت کرنا سیکھو۔ تم خود بخود آزاد ہو جاؤ گے۔ سچ کہتا ہوں۔ یہ چائے بُری نہیں لیکن پیالہ ٹوٹا ہوا ہے۔ تم لوگوں کا دل بُرا نہیں۔ لیکن یہ خول۔ یہ ماحول۔ یہ جسم اسے بدلنے کی ضرورت ہے۔ میں رنگ کا ذکر نہیں کر رہا۔ فرانسیسی قوم سفید رنگ کی قوموں میں پہلی قوم ہے جو حبشی کے رنگ سے پیار کرتی ہے۔ ہم لوگ دیوارِ رنگ میں یقین نہیں رکھتے۔ درحالیکہ امریکنوں کے ہاں بھی یہ دیوار موجود ہے۔ میں فرانسیسی ہوں۔ ڈیموکریسی کا سچا سپاہی۔ ۔ ۔ ۔ اچھا تو یہ بتاؤ۔ تمہیں یورپین عورتیں پسند ہیں۔ کیوں شاعر۔ ۔ ۔ ۔ تم سے تو پوچھنا بیکار ہے، اپنی محبوبہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"نہیں۔ اب ایسی بھی کیا بات ہے۔ سفید رنگ کی عورتیں پسند تو ہیں۔"

"اور تم جاوید؟"

"اچھی ہوتی ہیں۔ لیکن ذرا نا صاف ۔ ۔ ۔ ۔ جسم سے بدبُو آتی ہے۔

ویسے بڑی صحت مند ہوتی ہیں۔"

"اور تم شکاری۔ اچھا یہ بتاؤ۔ فلم ایکٹرسوں میں تمہیں کونسی پسند ہے۔"

"انگرڈ برگمین!"

سکنڈے نیوین ٹائپ ہے یعنی بالکل تمہاری ضد۔ آدمی تضاد کو اتنا کیوں پسند کرتا ہے، شاید یہ برقی قوت انسان کے اندر بھی کار فرما ہے۔ شاید یہ محبت بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ مثبت اور منفی قوت کی لہریں اُن کا تصادم، محبت...... چہ خوب...... ٹھیک تو ہے۔ مجھے دیکھو میں سفید رنگ کی عورت کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ اور انگریز عورت تو اس قدر بھدی ہے۔ کہ بالکل نظر سے اُتر چکی ہے۔ مجھے ہندوستانی عورت سے پیار ہے۔ عشق ہے۔ والہانہ محبت ہے۔ میں ہر ہندوستانی عورت سے پیار کرتا ہوں۔ ہر ایک سے۔ مجھے اُن کا رنگ پسند ہے۔ اُن کے بال پسند ہیں۔ اُن کی چال پسند ہے، اُن کی ہنسی پسند ہے۔ اُنکی شفقت پسند ہے۔ اُن کی ممتا۔ اُن کی حیا، اُن کی سمجھ...... اُن کی مظلومیت.. ...... یہ یورپی عورت تو بخدا بڑی بدصورت ہے۔ پوڈر اور غازے میں لپی پُتی، گندی، اور اس کا سایہ اور ٹانگیں ننگی۔ اور نیلی نیلی رگیں۔ اور

چتلے داغ..... اُف کس قدر گھناؤنا منظر ہے..... کہاں وہ دلفریب سایوں کا بہاؤ جیسے سمندر کی لہریں ساحل کی ریت پر..... وہ قُم قُم کا ٹیکہ..... شاید میں بھی تمہاری طرح اپنی ضد کو پسند کرتا ہوں۔ مجھے ہندوستان میں صرف اندھرا کی عورتیں پسند ہیں، میں تو کسی ہندوستانی عورت سے شادی کروں گا۔"

"جھوٹ بولتے ہو پال۔ تم کسی فرانسیسی کنواری کیسی گیسکاں لڑکی سے شادی کرو گے۔ اور جنگ کے بعد فرانسیسی شراب کی تجارت کرو گے۔ ہندوستان میں بھلا تم کیا رہو گے۔"

"یہ سچ ہے میں فرانس کو نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن میں — میں ہندوستان کی ایک دیوی کو فرانس لے جانا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے۔ میرا ملک اُس کا استقبال کرے گا۔ میرا خیال ہے میرے ماں باپ اُسے پسند کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ وہ میرے ساتھ خوش رہ سکے گی میں ہندوستان کی روح کو سمجھتا ہوں۔ اس لئے ہندوستانی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اُس کے لئے میں ایک چھوٹا سا مندر بنواؤں گا فرانس میں۔ یہ فرانس اور ہندوستان کی شادی ہو گی۔"

"وہ شادی جو ڈوپلے اور لالی اور نپولین نہ کرا سکا.....!"

"تم بھولتے ہو پیارے۔ میں وہ فرانسیسی نہیں ہوں۔ میں روسو اور والتیر کا فرانس ہوں۔ میں سامراجی نہیں ہوں۔ میں ڈیموکریسی کا سپاہی ہوں۔ آؤ، چلو، کہیں چل کر تھوڑی سی شراب پئیں۔ اور کسی ہندوستانی لڑکی کا ناچ دیکھیں۔ مجھے ہندوستانی بازار بہت پسند ہیں۔ اور وہ سرخ سرخ پردے جن کے اندر وہ ہندوستانی لڑکیاں ناچتی ہیں..... چھم چھم چھم چھم..... ہا ہا ہا!"

"پال"

"ہُم"

"رینے کلیر کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

"بہت اچھا فلم ڈائرکٹر ہے۔ فرانس کا بہترین ہدایت کار۔ جسے ہالی وڈ نے تباہ کر دیا۔ یہی ہوتا ہے جب کوئی فرانسیسی اپنے ملک سے باہر جاتا ہے۔ وہ تباہ ہو جاتا ہے۔ یہ قوم اسی طرح تباہ ہوئی ہے۔ تمہیں معلوم ہے میں رینے کلیر کا اسسٹنٹ رہ چکا ہوں۔"

"نہیں ۔ مجھے معلوم نہ تھا"

"اُس کے لئے میں ایک کہانی بھی لکھ رہا تھا۔ پھر جنگ سر پر آگئی۔
اور سب کچھ رہ گیا"

"اُس کہانی میں کیا تھا"

"ماں اور بیٹی دونوں کو ایک ہی آدمی سے عشق ہے۔ اور یہ آدمی اُس
کی ماں کا ناجائز خاوند ہے یعنی اُس بیٹی کا باپ"

"بہت خوب ۔ پھر کیا ہوتا ہے"

"پھر ــــ مگر یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ آخر میں یہ ہوتا ہے۔ کہ بیٹی اور باپ
خاوند اور بیوی کی طرح رہتے ہیں۔ کوئی باقاعدہ شادی نہیں ہوسکتی مگر اس
سے کیا ہوتا ہے محبت لازوال ہے ــــ بیرہ! دو لارج وسکی لاؤ...."

"پال تم آج بہت خوش نظر آرہے ہو۔ کیا بات ہے"

"ایک بات ہے تمہیں بتانا چاہتا تھا، مگر میں نے سوچا چوتھے پیگ
کے بعد بتاؤں گا"

"کہو"

"میں کل صبح ہندوستان سے رخصت ہو رہا ہوں۔ میں فرنچ سیریا جا

رہا ہوں۔"

"اس میں خوشی کی کیا بات ہے۔"

"یہی کہ میں فرنچ سیریا جا رہا ہوں۔ہندوستان چھوڑ رہا ہوں۔وہاں سے بحیرہ روم کا منظر شروع ہوتا ہے۔پیرس دو قدم پر ہے اور پھر سچ پوچھو تو وہ فرنچ سیریا ہے۔اپنا ملک ہے۔

"پال وہ تمہارا ملک کس طرح ہے۔"

"کیا کہتے ہو تم۔"

"غور کرو۔فرنچ سیریا۔تمہیں ان لفظوں میں کچھ دکھائی دیتا ہے۔باہر سے مت پڑھو ان لفظوں کو۔انہیں اندر سے پڑھو پال۔فرنچ سیریا۔۔۔۔ فرنچ گیوں۔تمہیں اس میں کوئی عجیب بات نظر آتی ہے۔فرنچ سیریا برٹش انڈیا، ڈچ بورنیو، تمہیں ان خوشرنگ، چمکتے ہوئے الفاظ کے پردوں میں کہیں تاریکی کی جھلک نظر آتی ہے؟"

"لو۔وسکی پیو۔۔۔۔۔"

"پال تم کل جا رہے ہو۔میں بہت خوش ہوں۔تم ایک ذہین فرانسیسی ہو۔تم یورپ کے کلچر۔تہذیب اور مذہب کا بہترین آئینہ ہو۔شراب پیو

دوست تم کل فرنچ سیریا جا رہے ہو۔ تاریخ کا یہ تواتر ڈیڑھ دو سو برس سے چلا آرہا ہے۔ ڈیڑھ دو برس کیا ہوتے ہیں۔ ڈیڑھ دو دن ڈیڑھ دو لمحے کچھ بھی نہیں دوست۔ پھر اگر کل کو یہ تواتر بدل جائے۔ اور کوئی سپاہی تم سے کہے میں چینی فرانس۔ ہندی برطانیہ اور حبشی اطالیہ میں جا رہا ہوں۔ تو تمہیں خوشی حاصل ہوگی ؟"

"بہت پی گئے ہو شاید پی کر تمہارا احساسِ کمتری بولنے لگتا ہے۔"

"احساسِ کمتری نہیں۔ احساسِ برتری بول رہا ہے۔ آج معلوم ہوا تم کتنے چھچھورے ہو۔ تمہاری تہذیب وقتی ہے۔ تمہاری خوشی وقتی ہے تمہاری فوقیت وقتی ہے دوست، تم مر چکے ہو۔ کیونکہ تم نے اپنے دل میں ناانصافی اور ظلم اور بے رحمی کو جگہ دی ہے۔ ذلیل ہندوستانی! ...

.... پال مجھے گھونسا مت دکھاؤ، اسے اُس ہندوستانی عورت کے لئے سنبھال کر رکھو جس کے لئے تم فرانس میں مندر بنا رہے تھے۔ وہ مندر کب کا مسمار ہو چکا۔ وہ مندر جس میں روسو اور والتیر کی روح نے جنم لیا تھا۔ میں ذلیل ہوں لیکن زندہ ہوں۔ تم ارفع ہو لیکن مر چکے ہو۔ اور مجھے مُردوں سے کوئی علاقہ نہیں۔ جاؤ فرنچ سیریا جاؤ، یا ڈچ افریقہ،

تیسری جنگِ عظیم تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ جس طرح دن کے بعد رات آتی ہے۔ اُسی طرح وقتی صلح کے بعد پھر جنگ آئے گی۔ کیونکہ پاؔل تم ابھی تک نفرت کے قبرستان میں سو رہے ہو ــــ مجھے روکو نہیں... مجھے بولنے دو۔ آج میری باری ہے۔ اور تم فرنچ تیسر پا جا رہے ہو اور ہم دونوں وسکی پی رہے ہیں، ایک زندہ ایک مردہ۔ ایک ذلیل، ایک بے رحم، ٹھہر جاؤ پاؔل...... یہاں سے اُٹھ کر کہاں جا رہے ہو...... اپنے دوست کا آخری سلام تو لیتے جاؤ...... سُنو میں اکیلا نہیں ہوں پاؔل میں چالیس کروڑ ہوں...... میں نفرت نہیں ہوں میں محبت ہوں میں نپولین نہیں ہوں۔ میں اشوکؔ ہوں۔ میں اکبرؔ ہوں۔ میں گوتمؔ ہوں۔ چشتیؔ ہوں۔ کبیرؔ ہوں۔ کبیرؔ کا نام سُنا ہے تم نے؟ سنتے جاؤ پاؔل، میں اجنتاؔ ہوں۔ ایلوراؔ ہوں۔ میں تاج محل ہوں...... میں محبت ہوں۔ عشق و انسانیت کی تفسیر ہوں، تم آزاد ہو کر بھی محبت نہیں کر سکتے۔ میں غلام رہ کر بھی تم سے محبت کرتا ہوں، میرا گھر بڑا ہے۔ میرا دل بڑا ہے، میری روح عظیم ہے،...... ٹھہر جاؤ۔ پاؔل۔ یہ چنبیلی کے پھولوں کا ہار لیتے جاؤ۔ ایک ذلیل ملک کا آخری تحفہ...... سُنو...... سُنو پاؔل! پاؔل!

پال

میں تمہیں اُس تیسری جنگِ عظیم سے بچانا چاہتا ہوں۔ سُنو پال۔ مجھے تم سے نفرت نہیں ہے۔۔۔۔۔ مجھے تم سے نفرت نہیں ہے۔۔۔۔۔۔!"

غالیچہ

اب تو یہ غالیچہ پرانا ہو چکا، لیکن آج سے دو سال پہلے جب میں نے
اسے حضرت گنج میں ایک دکان سے خریدا تھا اس وقت یہ غالیچہ بالکل معصوم
تھا، اس کی جلد معصوم تھی، اس کی مسکراہٹ معصوم تھی، اس کا ہر رنگ
معصوم تھا، اب نہیں، دو سال پہلے، اب تو اس میں زہر گھل گیا ہے' اس کا
ایک ایک تار مسموم اور متعفن ہو چکا ہے، رنگ ماند پڑ گیا ہے' تبسم میں آنسوؤں
کی جھلک ہے' اور جلد میں کسی آتشک زدہ مریض کی طرح جا بجا گڑھے پڑ
گئے ہیں' پہلے یہ غالیچہ معصوم تھا۔ اب قنوطی ہے' زہرخند ہنسی ہنستا ہے' اور
اس طرح سانس لیتا ہے' جیسے کائنات کا سارا کوڑا کرکٹ اس نے اپنے

سینے میں چھپا لیا ہو۔

اس غالیچے کا قد نو فٹ ہے، چوڑائی میں پانچ فٹ، بس جتنی ایک اوسط درجے کے پلنگ کی چوڑائی ہوتی ہے، کنارا چوکور بادامی ہے، اور ڈیڑھ انچ تک گہرا ہے، اس کے بعد اصل غالیچہ شروع ہوتا ہے، اور گہرے سرخ رنگ سے شروع ہوتا ہے، یہ رنگ غالیچے کی پوری چوڑائی میں پھیلا ہوا ہے، اور دو فٹ کی لمبائی میں ہے، گویا ۲ × ۵ فٹ کی مستطیل، سرخ رنگ کی ایک جھیل بن گئی ہے لیکن اس جھیل میں بھی سرخ رنگ جھلکیاں، کئی رنگوں کے تماشے دکھاتی ہیں، گہرا سرخ، گلابی، ہلکا قرمزی، اور سرخ جیسے گندہ خون ہوتا ہے، لیٹتے وقت غالیچے کے اس حصے پر میں ہمیشہ اپنا سر رکھتا ہوں، اور مجھے ہر بار یہ احساس ہوتا ہے، کہ میرے سر میں جونکیں لگی ہیں۔ اور میرا گندہ خون چوس رہی ہیں۔

پھر اس خونی مستطیل کے نیچے پانچ اور مستطیلیں ہیں، جن کے الگ الگ رنگ ہیں۔ یہ مستطیلیں غالیچے کی پوری چوڑائی میں پھیلی ہوئی ہیں، اس طرح کہ آخری مستطیل پر غالیچے کی لمبائی بھی ختم ہو جاتی ہے، اور دری کی کور شروع ہوتی ہے، ..... خونی مستطیل کے بالکل نیچے تین چھوٹی چھوٹی

مستطیلیں ہیں، پہلی سپید اور سیاہ رنگ کی شطرنجی ہے۔ دوسری سپید اور
نیلے رنگ کی، تیسری بلو بلیک اور خاکی رنگ کی، یہ شطرنجیاں دُور سے بالکل
چیچک کے داغوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں، اور قریب سے دیکھنے پر بھی
ان کے حسن میں زیادہ اضافہ نہیں ہوتا۔ بلکہ نیلام شدہ پرانے گرم کوٹوں کی جلد
کی طرح میلی میلی اور بدنما نظر آتی ہیں۔ پہلی مستطیل اگر خون کی جھیل ہے تو یہ
تین چھوٹی چھوٹی مستطیلیں مجموعی طور پر پیپ کی جھیل کا تاثر پیدا کرتی ہیں۔
ان کے سپید، کالے، پیلے، بلو بلیک رنگ پیپ کی جھیل میں گڈمڈ ہوتے نظر
آتے ہیں، اس جھیل میں میرے شانے، میرا دل، اور میرے پھیپھڑے لسلسیا
کے بکس میں دھرے رہتے ہیں۔

چوتھی مستطیل کا رنگ پیلا ہے، اور پانچویں کا سبز ہے، لیکن ایسا سبز ہے
جیسے گہرے سمندر کا ہوتا ہے، ایسا سبز نہیں جس طرح موسم بہار کا ہوتا ہے
یہ ایک خطرناک رنگ ہے، اسے دیکھ کر شارک مچھلیوں کی یاد تازہ ہوتی ہے
اور ڈوبتے ہوئے جہاز رانوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں، اور اچھلتی ہوئی
طوفانی، دیوہیکل لہروں کی گونج اور گرج رعشہ پیدا کرتی ہے، اور یہ پیلا
مٹیالا رنگ تو منحوس ہئی۔ یہ رنگ زعفران کی طرح بسنت کی طرح پیلا نہیں

یہ رنگ مٹی کی طرح پیلا ہے، تپ دق کے مریض کی طرح پیلا ہے، پہلے گناہ کی طرح زرد ہے، ایک ایسا زرد رنگ جس میں شاید اک ہلکا سا احساس ندامت بھی شامل ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے یہ مستطیل بار بار کہہ رہی ہو۔ میں کیوں ہوں، میں کیوں ہوں .....!

جہاں میں اپنا احساس رکھتا ہوں، اُس کے دائیں کونے میں نیلے اور پیلے رنگ کے دس خطوط و حدانی بنے ہوئے ہیں، اور جہاں میں اپنے پاؤں پسار کے سوتا ہوں، وہاں گیارہ خطوط و حدانی ہیں۔ یہ پیلے اور فیروزی رنگ کے ہیں، غالیچے کے وسط میں چھ خطوط و حدانی سرخ و سپید رنگ میں ہیں اور ان کے بیچ میں ایک گہرا سیاہ نقطہ ہے، ..... جب میں غالیچے پر لیٹ جاتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا سر سے پاؤں تک کسی نے مجھے ان خطوط و حدانی کی مکوں میں جکڑ لیا ہے۔ مجھے صلیب پر لٹکا کر میرے دل میں ایک گہرے سیاہ رنگ کی مینخ ٹھونک دی ہے چاروں طرف گندہ خون ہے، پیپ ہے، اور سبز رنگ کا سمندر ہے۔ جو شارک مچھلیوں اور سمندری ہزار پایوں سے معمور ہے، شاید مسیح کو بھی صلیب پر اتنی ایذا نہ پہنچی ہوگی، جتنی مجھے اس غالیچے پر لیٹتے وقت حاصل

ہوتی ہے لیکن ایذا پرستی تو انسان کا شیوہ ہے، اسی لئے تو یہ غالیچہ میں اپنے
آپ سے جدا نہیں کر سکتا۔ نہ اس کی موجودگی میں مجھے کوئی اور غالیچہ خریدنے
کی جرأت ہوتی ہے، میرے پاس یہی ایک غالیچہ ہے، اور میرا خیال ہے
کہ مرتے دم تک یہی ایک غالیچہ رہے گا۔

اس غالیچے کو در اصل ایک خاتون خریدنا چاہتی تھی، حضرت گنج میں
ایک دکان کے اندر وہ اسے کھلوا کر دیکھ رہی تھی، کہ میری نگاہوں نے
اسے پسند کر لیا، اور وہ خاتون کچھ فیصلہ نہ کر سکی اور اسے وہیں چھوڑ کر
اپنے بلاؤز کے لئے ریشمی کپڑے دیکھنے لگی،

میں نے منیجر سے کہا "یہ غالیچہ میں خریدنا چاہتا ہوں"۔

وہ خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا مس روپ وتی ---
شاید --- انہوں نے اسے پسند کر چکی ہیں۔ شاید! --- ٹھہریئے میں اُن سے
پوچھتا ہوں۔

روپ وتی بولی۔ "غالیچہ --- بُرا نہیں!"

"بُرا نہیں؟ کیا مطلب ہے آپ کا" میں نے بھڑک کر کہا "ایسا
غالیچہ دنیا میں اور کہیں نہیں ہوگا۔ دانتے کے تخیل نے بھی ایسا نقشہ

تیار نہ کیا ہوگا، یہ غالیچہ ہسپتال کی گندی بالٹی کی طرح حسین ہے، امراض خبیثہ کی طرح روح پرور ہے، یہ آگ اور پیپ کا دریا حاتم طائی کے سفر کی یاد دلاتا ہے۔ قدیم اطالوی راہب مصوروں کے شاہکاروں کی یاد تازہ کرتا ہے۔ یہ غالیچہ نہیں ہے تاریخ ہے، انسان کی روح کی!"

وہ مسکرائی، دانت بیحد سفید تھے، لیکن ذرا ٹیڑھے میڑھے اور ایک دوسرے سے بہت قریب، پھر بھی وہ مسکراہٹ اچھی معلوم ہوئی، کہنے لگی "کیا آپ کبھی اٹلی گئے ہیں؟"

میں نے کہا "اٹلی کہاں! میں تو کبھی حضرت گنج کے اس پار نہیں گیا عمر گزری ہے اسی ویرانے میں، یہ پان کی دکان اور سامنے وہ کافی ہاؤس"

منیجر نے اب تعارف کرانا مناسب سمجھا۔ بولا "آپ آرٹسٹ ہیں۔ کاغذ پر تصویر کھینچتے ہیں۔ یہ مس روپ وتی ہیں۔ یہاں لڑکیوں کے کالج میں پرنسپل ہوکر آئی ہیں۔ ابھی ابھی انگلینڈ سے تعلیم حاصل کرکے یہاں..."

وہ بولی "چلئے تو یہ غالیچہ آپ ہی لے لیجئے مجھے تو خاص پسند نہیں"

"آپ کا بڑا احسان ہے" میں نے غالیچے کی قیمت ادا کرتے ہوئے کہا "کیا آپ میرے ساتھ ___ کافی پینا گوارا کریں گی، چلئے نا ذرا کافی ہاؤس

تک، اگر ناگوارِ خاطر، یعنی ——"

"شکریہ۔ مگر میں ذرا یہ بلاؤز دیکھ لوں۔" وہ پھر مسکرائی،

مسکراہٹ بھی بھلی معلوم ہوئی، ذہین بیضوی چہرے کا رنگ زرد تھا،

صندلی رنگت پر لبوں کی ہلکی سی سُرخی اک عجیب رسیلا تموج سا پیدا کر رہی تھی

بلاؤز کا کپڑا خرید کر جب وہ میرے ساتھ چلنے لگی، تو لڑکھڑا گئی۔ میں نے

بانہہ سے پکڑ کر سہارا دیا اور پوچھا "کیا بات ہے۔ کیا آپ ہمیشہ لڑکھڑا کر

چلتی ہیں؟"

وہ بولی "نہیں تو۔۔۔۔" میں نے غور سے دیکھا۔ پاؤں پر پٹی بندھی

ہوئی تھی۔

"زخم ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ انگوٹھے کا ناخن بڑھ گیا تھا۔ جلد کے اندر۔۔۔۔ جہاز کا سرجن

بالکل گدھا تھا۔۔۔۔" اُس نے ماتھے پر ساری کا پلّو سرکایا اور جب وہ پہلی

بار مڑی تو میں نے اُس کے بالوں میں گردن کے قریب دائیں طرف گلاب

کے زرد پھول ٹکے ہوئے تھے، پھر جب وہ مڑی تو ماتھے کا قم قم درخشاں

نظر آیا۔ اس سے پہلے کیوں یہ قم قم اس قدر خوبصورت نہ تھا؟

کافی ہاؤس میں بیٹھ کر معلوم ہوا کہ وہ خوبصورت تھی، کچھ تو کافی ہاؤس
میں روشنی کا انتظام ایسا ہے کہ مرد بدصورت نظر آتے ہیں، عورتیں حسین تر،
پھر — ہاں — کچھ تو تھا، ورنہ یہ لوگ بار بار مڑ کر کیوں دیکھتے تھے، عورتیں
تیز نگاہ سے کیوں گھورتی تھیں، بیرے اتنی جلدی میز پر کیوں آجاتے تھے۔
وہ مسکرا کر کہنے لگی۔۔۔۔ "دیکھو بیرا، تھوڑا سا گرم دودھ اور گرم پانی
ایک الگ پیالے میں۔"

"گرم پانی تو —" بیرے نے رک کر کہا۔

تھوڑا سا گرم پانی، بس!" وہ پھر مسکرائی، اور بیرا سر سے لیکر پاؤں
تک پگھل گیا، جیسے اُس کا سارا جسم شیشے کا بنا ہو، میں اُسے پگھلتے ہوئے
دیکھ رہا تھا، اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی، اور اُس کے سارے جسم
کو پگھلاتی ہوئی چلی گئی، یہ نگاہ کیا ہے؟ یہ تجلّی کیسی ہے؟ کیا یہ کافی ہاؤس
کی بجلیوں کا شعبدہ تو نہیں؟

"اور بیرا — انڈے کے سینڈوچ!" وہ پھر بولی۔

بیرے نے واپس آکر کہا۔ "جی انڈے کے سینڈوچ تو ختم ہو گئے۔"

"تھوڑے سے بھی نہیں؟" اُس کی بڑی بڑی معصوم زخمی سی آنکھیں

اور بھی کھلتی ہوئی معلوم ہوئیں، بس لاچار'' ایک پلیٹ بھی نہیں ؟''
سینڈوچ بھی مل گئے۔

''نہیں بل میں ادا کروں گی۔''
''نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں مرد ہوں۔''
وہ ہنسی، بہت پرانی بات ہے۔'' اور اس نے بل ادا کر دیا۔
گھر پہ نوکر کو غالیچہ پسند نہ آیا، ان دنوں ایک تنک مزاج شاعر مہمان تھا جو آزاد بحر میں نظمیں لکھا کرتا تھا۔ شراب پیتا تھا اور پانچ وقت نماز ادا کرتا تھا، اُسے بھی غالیچہ پسند نہ آیا۔ میں نے پوچھا تو بس '' ہوں '' کر کے رہ گیا، وہ نظمیں جتنی لمبی لکھتا تھا، باتیں اُسی نسبت سے کم کرتا تھا۔
''ہوں '' کا کیا مطلب ہے۔'' میں نے چڑ کر کہا۔ ''کچھ تو کہو ان رنگوں کا تناسب ''

''ہوں۔''
روپ اُسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اب وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
اُس سڑے بُسے شاعر سے کہنے لگی، اپنی تازہ نظم سناؤ، ...... تمہیں معلوم ہے

آج کل اسپنڈر، اور لاڈن اغلامیت کے حق میں نظمیں لکھ رہے ہیں۔

"ہوں" وہ اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر غرّایا۔

میں نے روپ سے پوچھا "تمہیں کیسے معلوم ہے؟ کیا اُن لوگوں نے تمہیں اپنی نظمیں سنائی تھیں"؟

"نہیں۔ لیکن مجھے جَو نے بتایا تھا"۔

"کون؟ جو؟"

"جَو براؤن، نام نہیں سُنا ہے کیا؟ آجکل آکسفورڈ کا محبوب ترین شاعر ہے، ہندوستان میں ابھی اُس کا کلام نہیں پہنچا، لندن میں مجھ پر عاشق ہو گیا تھا، وہ کچھ عجب، کچھ بیباک، کچھ شرمیلی سی ہنسی کے ساتھ کہنے لگی، اور ماتھے کا قمقم یاقوت کی طرح دمکنے لگا۔

میں نے پوچھا "تمہاری زندگی فتوحات سے پُر معلوم ہوتی ہے!"

"نہیں" اُس نے آہ بھر کر کہا۔ اس طرح کہ میرا جی چاہا اُسے گلے سے لگا لوں۔

"ہوں" شاعر بولا۔

روپ مسکرا کر کہنے لگی "تمہارا شاعر بہت باتونی ہے۔۔۔۔

..... سُنو..... تمہیں ایک نظم سناتی ہوں۔"

میری حیرت بڑھتی جارہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "تم شاعر بھی ہو"

"نہیں۔ یہ نظم میری والدہ نے کہی تھی۔"

"ٹھہرو۔ مجھے یہ غالیچہ بچھا لینے دو۔"

غالیچہ بچھ گیا۔ اور نظم رُوپ نے گا کر سنائی، بنگالی نظم تھی، اور اس محزوں شب فراق کی جلی ہوئی، شمع کی طرح خوبصورت تھی، آواز شعلے کی طرح لرزاں تاثر شراب کی طرح خمار آگیں، بنگالی دوشیزائیں قطار اندر قطار..... گھڑے اٹھائے ہوئے گھاٹ کی طرف جارہی تھیں۔ سمندر کی سبز لہریں اچھل رہی تھیں۔ شوجی کا ڈمرو بج رہا تھا، پاربتی رقص کررہی تھیں، برف گر رہی تھی ..... اب فضا خاموش تھی، اور روپ کی آنکھوں میں آنسو تھے..... آنسو رخساروں سے ڈھلک کر غالیچے پر گر پڑے، اور وہ سرخ مستطیل جیسے آگ کا شعلہ بن گئی.....!

"تمہیں جو براؤن سے عشق نہیں ہوا۔" میں نے پوچھا۔

روپ نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ بولی۔ مجھے جس لڑکے سے عشق تھا اسے لندن ہی میں تپ دق ہوگیا تھا۔ وہ جہاز پر میرے ساتھ آرہا تھا، لیکن

راستے ہی میں اس کی موت ہو گئی، عدن سے پرے بحیرہ سُرخ میں!"

"بحیرہ سرخ" میں نے سوچا۔ اور غالیچے کی سرخ مستطیل بحیرہ سرخ بن گئی، اور اس کے گہرے پانیوں میں مجھے اک زرد رُو کھانستا ہوا چہرہ نظر آیا، اور پھر بھنور میں غائب ہو گیا، محوِ خواب ہے۔ محوِ خواب ہے رُوپ کا محبوب، سرخ سمندر کے پانیوں میں اور روپ کے آنسو میرے غالیچے پر گر رہے ہیں......

"ہوں" شاعر نے کہا۔ اور میں نے ایک کتاب اس کے سر پر دے ماری۔

روپ آنسوؤں میں مسکرا دی بعض اوقات آنسو رونے سے آنسو پینا زیادہ اندوہناک معلوم ہوتا ہے!

روپ!

کیسی عجیب سی لڑکی تھی وہ، لندن میں شاعر جو براؤن اُسے محبت کرتا تھا، اور لکھنؤ میں حضرت گنج کا یہ آوارہ مزاج غریب آرٹسٹ اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ زہر ہے وہ کس طرح اس پیالے کو پی گیا، یاسیت، نامرادی، بے بسی، عشق کا جواب ہمیشہ عشق کیوں

نہیں ہوتا؟ یہ کیسی آگ ہے جو ایک کو جلاتی ہے اور دوسرے کے دل میں برف کی سل بن جاتی ہے، جو محرومِ تمنّا کو آنسو رلاتی ہے اور جانِ تمنّا کے لبوں پہ تبسم ریز سایہ بھی نہیں لا سکتی۔

میں نے غالیچے کو تھپکتے ہوئے پوچھا۔

غالیچے نے کہا۔ میں صلیب ہوں، میں دکھ اور درد جانتا ہوں۔ دکھ اور درد کی دوا نہیں جانتا!

اور روپ نے کہا۔ یہ قسمت ہے، قسمت تمہیں غالیچہ خریدنے کے لئے وہاں لے گئی، قسمت نے تمہیں مجھ سے روشناس ہونے کا موقعہ دیا، اب یہ تمہاری قسمت ہے کہ مجھے تم سے وہ محبت نہ ہو سکی، ہزار کوشش کرنے پر بھی یہ رفاقت محبت میں مبدّل نہیں ہو سکتی۔ یہ قسمت نہیں تو اور کیا ہے؟

پھر کہنے لگی "شاعر اپنے شعر سناؤ۔"

چند روز کے بعد اُس نے یکایک مجھ سے کہا "مجھے تمہارے شاعر سے محبت ہو گئی ہے۔"

"جھوٹ..... اِس مُنہ سے....."

"اُس کی آنکھیں دیکھیں تم نے" وہ آہ بھر کر بولی "جیسے مسیح دار پہ

لٹکا ہو۔ کتنا اندوہ ہے انہیں!"

میں نے کہا: "اگر تم کہو تو میں اپنی آنکھیں اندھی کر لوں۔"

شاید میری تلخی اُسے ناگوار گزری۔ سنجیدہ رو ہو کر بولی: "کیا کروں"

"ہاں دل ہی تو ہے!" میں نے طنزاً کہا۔

"ہوں" شاعر بولا۔

جس روز وہ دونوں رخصت ہوئے، میں نے گھر پر اک چھوٹی سی دعوت دی، روپ نے ڈھاکے کی سیاہ ساری پہنی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں کاجل گہرا تھا۔ ریشمی چوڑیوں کا رنگ بھی سیاہ تھا، ہر روز اُسے دیکھ کر اجیالے کا، سورج کا، چاند کا، چاند کی کرن کا، روشنی کا احساس ہوتا تھا۔ نہ جانے آج اُسے دیکھ دیکھ کر کیوں تاریکی کا احساس ہو رہا تھا۔ کیوں وہ اس اپنی مکمل کامرانی کے لمحوں میں بھی مجسم یاس و غم کی تصویر دکھائی دیتی تھی، کیا یہ غریب آرٹسٹ کے دل کا اندھیرا تو نہیں تھا۔ کیا یہ اُس کے برش کی تاریکی تو نہ تھی! آج میں نے اس سے وہی گیت سننے کی تمنا کی تھی جو اس نے پہلے روز گایا تھا.... مجھے یاد ہے، گانے کے بعد وہ ناچی بھی تھی، میں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا، میں اس کے پاؤں دیکھتا رہا، دھندلے

دھندلے تاریک سے پاؤں جن میں حنا کی سرخ لکیر بجلی کی طرح چمک چمک جاتی تھی، اُس تاریکی میں صرف یہاں روشنی تھی، وہ ناچتی رہی، اور میں اُس تاریکی میں حنائی لکیر کا ناچ دیکھتا رہا۔ اور جب ناچ بھی بند ہو گیا، تو میں نے وہ پاؤں اٹھا کر اپنے سینے میں رکھ لئے، کیوں یہ پاؤں آجتک اس سینے میں محفوظ ہیں، ..... کیا اس اہرام میں ممیوں کے سوائے اور کسی کے لئے جگہ نہیں ؟

جب وہ چلی گئی تو میں پھر غالیچے پر آ بیٹھا، زرد گلاب کی اک کلی اُس کے جُوڑے سے نکل کر غالیچے پر پڑی رہ گئی تھی ..... میرے دل میں شاید اب روپ کی کوئی یاد باقی نہیں، صرف یہ دو پاؤں ہیں اور اک یہ گلاب کی زرد کلی، ..... کیسی تصویر ہے یہ ؟ مصور ہو کر بھی میں نے شاید ایسی عجیب تصویر اس سے پہلے کبھی نہ بنائی تھی۔ ... پھر ؟

میں غالیچے سے پوچھتا ہوں۔

غالیچہ کہتا ہے "میں تو صلیب ہوں، صلیب موت بخشتی ہے" اُسے زندگی کی ترتیب، تناسب، تواتر سے آگاہی نہیں، .....

اچھا اسے بھی جانے دو، جو ہُوا سو ہُوا، اگر زندگی میں قبر ہی کا مزا لینا ہے تو کیوں نہ اسے آرام سے حاصل کیا جائے، اگر شہد میں زہر ہی ملا کے پینا ہے تو کیوں نہ خالص زہر پیا جائے، اگر معصومیت برقرار نہیں رہ سکتی، تو کیوں نہ گہری معصیت کی آغوش میں پناہ لی جائے، آؤ، اپنے دل میں ضمیر کی جو اک ہلکی سی شمع رہ گئی ہے اسے بھی خموش کر دیں اور بڑھتی ہوئی تاریکی میں گناہ کے پھیلتے ہوئے دود کو دیکھیں اور زندگی کا منہ چڑائیں اور قہقہے لگائیں

محبت نہ سہی، بوالہوسی سہی!

آرٹسٹ نے اک اور لڑکی سے آشنائی پیدا کر لی، جو دبیک میں ملازم تھی، اُس کا نام تھا آشا، لیکن صورت پر بالکل نراشا برستی تھی، ایسی بھولی لڑکی تھی وہ، کبھی مرد دیکھا ہی نہ تھا، کُتیا کی طرح ساتھ ساتھ لگی پھرتی تھی، بے چاری آرٹسٹ کو شاید اس پر رحم آنے لگا تھا، وہ اس کے ساتھ شفقت برتنے لگا، اک مربیانہ، پدرانہ انداز کے ساتھ اب وہ اسے ہر جگہ لئے لئے پھرتا، لوگ طنزاً اس کے حسنِ انتخاب کی داد دیتے اور وہ بظاہر بڑے خلوص سے داد قبول کرتا، کوئی کہتا، بھئی، بڑی بدصورت ہے وہ، تم نے کیا سوچ کر۔ تو وہ لڑنے پر آمادہ ہو جاتا، گھنٹوں اس کی خوبصورتی کا تجزیہ کرتا، کوئلے سے

اُس نے آشا کی تصویر بنائی تھی۔ اور اپنے سٹوڈیو میں ہر کس وناکس کو وہ یہ تصویر دکھاتا تھا۔ وہ اپنے زخم دکھا رہا تھا۔ دیکھو..... دیکھو..... دیکھو..... مجھے تمہاری کیا پروا ہے..... میں اپنی روح کا آپ مالک ہوں..... زہرخند! .....کوٹلے!

لیکن وہ جو کبھی حضرت گنج کے اُس پار نہ گیا تھا۔ اب وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کرنے لگا فٹ پاتھ پر چلتے چلتے وہ ہزاروں الٹے سیدھے خواب دیکھنے لگتا، رہگذر کے ہر پتھر پر اسے کسی کے پیروں کے دھندلے دھندلے سائے کانپتے ہوئے معلوم ہوتے، کافی کی پیالی کے ہر سانس میں وہ اُس کے گرم سانس کا مس محسوس کرتا، اور برقی شمعدانوں کے براق اجیالے میں اسے ہزاروں قمقمے تیرتے ہوئے دکھائی دیتے، یہ ہنسی؟ وہ مڑکر دیکھتا کہاں سے آئی تھی، لیکن یہ تو وہی کشمیری بالنو مینا اپنے پنجرے میں چہک رہی تھی، بلبل قفس کی تیلیاں توڑ کر پرواز کر گئی تھی اور وہ ابھی تک کیوں حضرت گنج کے ویرانے میں مقید تھا..... کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ وہ خاکی لکیر بار بار بجلی کی طرح چمک کر اس سے بار بار پوچھ رہی تھی!

اب جبکہ وہ شہر چھوڑ کر جا رہا تھا اس نے اپنے سب دوستوں کو اس

ویک لڑکی کو، اور اُس کی سب سہیلیوں کو آخری دعوت دی تھی، اور جب دعوت کے بعد سب لوگ چلے گئے تھے۔ تو ویک لڑکی حیران و پریشان اسی غالیچے پر بیٹھی رہی تھی، اور پھر یکایک اس کے سینے سے لگ کر رو پڑی تھی، یہ گرم گرم آنسو جو اُس کے سینے میں برف کے پھول بنے جا رہے تھے عشق کا جواب عشق کیوں نہیں ہوتا، یہ کیسی آگ ہے جو ایک کو جلاتی ہے اور دوسرے کے دل میں برف کی سِل بن جاتی ہے!

ایک لڑکی غالیچے پر لیٹی تھی، بازو اُوپر کے خطوط وحدانی کے ٹیک میں تھے پاؤں نیچے کے خطوط وحدانی میں، غالیچے نے چپکے سے اس کے دل میں اک سیاہ میخ ٹھونک دی، اہرام کے لئے ایک اور ممی تیار ہو گئی، لیکن وہاں جگہ کہاں تھی، سینے میں اب بھی وہی دو پاؤں ناچ رہے تھے...... اور وہی گلاب کی اک زرد کلی!

میں نے غالیچے سے پوچھا "یہ کیسا کھیل ہے؟ میں کس کا منہ چڑا رہا ہوں یہ زخم کس کے ہیں، یہ لڑکی کیوں رو رہی ہے، اگر یہ سب قسمت ہے، تو پھر یہ کاوشِ پیہم کیا ہے جو ممی کو بھی زندہ کر دینے پر تلی ہوئی ہے۔"

غالیچے نے جواب دیا "مجھے معلوم نہیں۔ میں تو ایک صلیب ہوں"

جو دل میں سیاہ کیل ٹھونکتی ہے، سپید روشنی نہیں لاتی، جو قسمت کا انجام دکھاتی ہے، اُس کا آغاز و شباب نہیں!

تجھے جلا کر خاک نہ کر ڈالوں!

اس نئے شہر میں!

چار آدمی غالیچے پر تاش کھیل رہے ہیں۔

دو ایکٹر

دو تجّار

اور جو تماشا دکھا رہا ہے وہ آرٹسٹ ہے!

تاش کھیلتے کھیلتے ایکٹر اور تجار لڑنا شروع کرتے ہیں، ہاتھا پائی کی نوبت آتی ہے، غالیچہ نوچا جاتا ہے، کیونکہ ایک چال میں ایک تجّار غلطی سے یا جان بوجھ کر آٹھ آنے زیادہ لے گیا تھا، میرا گریبان تار تار ہو چکا ہے، کیونکہ جو آدمی لڑائی رفع کرنا چاہتا ہے، وہی سب سے زیادہ پٹتا ہے۔

پھر میں سوچتا ہوں۔ اس بدمزگی کو دُور کرنے کا کیا طریقہ ہے، بذلہ سنجی ناممکن! گراموفون؟ واہیات! چائے؟ لعنت! شراب؟ سبحان اللہ!

سب لوگ شراب پی رہے ہیں، آرٹسٹ کی آنکھیں سُرخ ہیں، ہمیشہ ہنستے اور خوش رہنے والا خوش شکل ایکٹر ہمیشہ چپ رہنے والے قبول صورت ایکٹر سے کہہ رہا ہے "محبت؟ محبت؟ سالا تُو محبت کیا جانے، ابھی کالج کا لونڈا ہے تُو...... ایں...... محبت کا نشہ مجھ سے پوچھ...... سالی یہ شراب بھی بالکل تلخ نہیں ہے...... رانی کو دیکھا ہے تُو نے؟"

"رانی ۱۹۴۴ء کی بہترین ایکٹرس ہے نا" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں، وہ ــــ وہی ــــ سالا تو کیا جانے...... وہ میری محبوبہ ہے...... سمجھے؟ ...... ایں! میں نے اس کے لئے اپنے ماں باپ کی گالیاں کھائیں...... کئی لڑائیاں لڑیں رقیبوں سے...... اپنا گھر بار چھوڑ دیا...... یہ انگوٹھی شالے دیکھتے ہو، یہ قمیص کے بٹن، یہ کف بٹن، یہ سب سونے کے ہیں، شالے تو کیا جانے...... یہ سب اُس نے دیئے ہیں...... تحفے...... مگر میں اس سے شادی نہیں کرونگا۔ کبھی نہیں کرونگا۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"کیوں؟"

وہ مجھے چاہتی ہے۔ پر وہ مجھ سے بہت امیر ہے...... وہ چاہتی ہے

کہ مجھ سے شادی کرے، پر میں مرجاؤں گا، اس سے بیاہ نہیں کرونگا۔"

"تمہیں اس سے محبت نہیں!" ایک تجار نے پوچھا۔

"لیکن بھئی۔ گھر آئی دولت کیوں چھوڑتے ہو۔" دوسرے تجار نے پوچھا۔

ایکٹر نے مٹھیاں بھینچ کر کہا" میں جو ہوں وہی رہونگا۔ میں اُس سے محبت کرتا ہوں، لیکن اس کا غلام بن کر نہیں رہ سکتا۔ میں اُس کی محبت چاہتا ہوں۔ دولت نہیں! اوخ!" ایکٹر نے زور سے غالیچے پر ہات مار کر کہا۔ اور پھر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا!

غالیچہ کانپ اُٹھا۔ اُس کا رنگ عجب سا ہو گیا

اور شراب دے حرامزادے!" وہ اپنے خالی گلاس کو ٹٹول رہا تھا۔

ہیر ... نے کہا۔" رانی؟ ارے بھئی آج ہی تو میں نے اخبار میں پڑھا ہے کہ رانی نے ایک امریکن سے شادی کر لی۔"

ایکٹر نے آہستہ سے شراب کا گلاس غالیچے پر لنڈھا دیا۔ اُس کی انگلیاں کانچ کی سطح پر سختی سے جم گئیں۔ کانچ اس کی انگلیوں کو زخمی کرتا ہوا ریزہ ریزہ ہو گیا۔

وہ ... ہوئے گلے سے کہنے لگا" یہ غلط ہے، بالکل غلط ہے!"

آرٹسٹ نے میز پر سے اخبار اُٹھا کر پڑھا۔

ایکٹر کا چہرہ! ..... وہ غالیچے پر دونوں کہنیاں ٹیکے میری طرف دیکھ رہا تھا.. اُسکے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اُس کا چہرہ تنتا جا رہا تھا ممی کے خدوخال اُبھر رہے تھے۔ "یہ غلط ہے۔ بالکل غلط ہے۔" وہ پھر چیخا، پھر اک دم خاموش ہو گیا۔ دوسرا ایکٹر اُس کے گلاس میں شراب انڈیلنے لگا۔ وہ اب بھی خاموش تھا، لیکن پہلا ایکٹر غالیچے سے لگ کر سسکیاں لے رہا تھا۔ پھر اُس نے غالیچے پر قے کر دی... مجھے غالیچے کا رنگ اُڑتا ہوا معلوم ہوا۔ سُرخ سے سپید و زرد جیسے یہ غالیچہ نہ ہو زندگی کا کفن ہو۔

رانی! رانی!! رانی!!!

صبح میں نے غالیچہ دھلوایا، اور صاف کرا کے پھر کمرے میں رکھا، کہ میری محبوبہ کمرے میں داخل ہوئی، یہ میری نئے شہر کی محبوبہ تھی، یہاں آ کر آرٹسٹ نے پھر عشق کر لیا تھا۔ عشق کرنا کس قدر مشکل ہے، لیکن جب عشق مر جائے، اُس کے بعد عشق کرنا کس قدر آسان ہو جاتا ہے! ہے نا! مردود بولتے کیوں نہیں ہو، جواب دو! میری محبوبہ کے ہونٹ موٹے تھے، رخسار بھی موٹے، جسم بھی موٹا، ہنسی بھی موٹی، عقل بھی موٹی، وہ عورت

نہ تھی، اک دوہرا تہرا غالیچہ تھی، آج اس نے اپنے بالوں کی دو چوٹیاں بنا ڈالی تھیں اور ان میں چنبیلی کے پھول سجائے تھے،

وہ غالیچے پر آکر بیٹھ گئی۔

میں نے اُس کی بلائیں لے کر کہا۔ "آج تو تم قلوپطرہ کو بھی مات کرتی ہو"

"قلوپترا کیا ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"مصر کی ملکہ تھی"

"مِسر؟"

"ہاں مصر! وہ ملک جہاں مرنے کے بعد اہرام تیار ہوتے ہیں۔ اور مُردوں کی ممیاں تیار کی جاتی ہیں۔۔۔۔ خدا کرے تمہاری موت بھی قلوپطرہ کی طرح ہو!"

"ہائے کیسی باتیں کرتے ہو؟ کیا مُوا اتھا اُسے۔۔۔۔!"

"سانپ سے ڈسوا کر مر گئی تھی!"

وہ اک ہلکی سی چیخ مار کر میرے قریب آگئی۔ "ڈراتے ہو مجھے" اُس نے میرا بازو پکڑ کر کہا۔ پھر وہ ہنسی، اپنی موٹی بھدّی ہنسی، جیسے بھینس جگالی کر رہی ہو۔۔۔۔ پھر اُس نے اپنے ہونٹ میرے آگے بڑھا دیئے، جیسے کوئی

غالیچہ

فیاض جاٹ کسی اجنبی شہری کو گتا چوسنے کو دے دے!

میں نے گنا چوستے ہوئے کہا: "غالیچہ جیتا ایک بار ہے لیکن مرتا بار بار ہے۔۔۔ آہ۔۔۔۔ یہ موت بار بار کیوں آتی ہے۔۔۔۔ اب آ بھی جائے آخری موت۔۔!"

"آج یہ تم کیوں بار بار موت کا ذکر کر رہے ہو؟" وہ منمنائی۔

"کچھ نہیں، تم نہیں سمجھو گی؟" میں نے کہا "ہاں یہ تو بتاؤ آج تمہارے تازہ لبوں سے، رخساروں سے، آنکھوں سے، بالوں سے، یہ کیسی لطیف خوشبو نکل رہی ہے؟"

"کچھ نہیں! وہ ہنس کر بولی" آج کھوپرے کا خوشبودار تیل لگایا ہے!"

میں نے غالیچے کی طرف کنکھیوں سے دیکھا، اس کا رنگ اڑتا جا رہا تھا بے چارہ ایک بار پھر مر رہا تھا، اُس کی جانکنی مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

سیدھا اسٹیشن پہنچ گیا، ارادہ تھا، جی بھر کر بیر پیونگا، نہ صرف اپنے گردوں کو بلکہ اپنی روح کو بھی جلاب دوں گا تاکہ یہ سارا کوڑا کرکٹ بہ جائے نکل جائے، طبیعت ہلکی ہو جائے۔

سٹیشن پر بیٹر سے پہلے روپ مل گئی۔

"ارے؟ تم کہاں؟"

جوناگڑھ گئی تھی پہاڑ پر۔"

"اور شاعر؟"

وہ کھانس کر کہنے لگی، اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔"

"چھوڑ دیا ہے؟ کیوں!"

"مجھے تپ دق ہے، جوناگڑھ سینی ٹوریم میں گئی تھی نا!"

اس کی نگاہوں میں سبز رنگ کا سمندر تھا، اور اک زرد رُو نحیف چہرہ بھنور میں غوطے کھا رہا تھا۔ پھر وہ چہرہ بھی غائب ہو گیا، اب شاعر کا سڑا بُسا بشرہ لہروں میں تیرنے لگا، شاعر کا چہرہ سر ہلا کر کہہ رہا تھا "ہوں"

میں نے کہا "کہاں ہے وہ حرامزادہ!"

"جانے دو۔ وہ محزوں انداز میں کہنے لگی۔ اسے گالی نہ دو.... مجھے اُس سے ابھی تک محبت ہے!"

"لیکن"

"ہاں" وہ بولی "اس لیکن کے بعد بھی ـــــ اب میں اپنے گھر جا رہی

ہوں، میکے، آرام سے مروں گی۔"

"نہیں، نہیں،" میں نے سختی سے کہا۔ "اب میں تمہیں نہیں جانے دونگا، زندگی نے تمہیں مجھ سے چھین لیا، اب موت کے دروازے تک ہم دونوں اکٹھے چلیں گے، اور اگر اس دنیا کے بعد کوئی دوسری دنیا ہے تو شاید؟ ——"

وہ ہنسی، وہی اجیالی ہنسی، وہی صندلی چہرہ، وہی دمکتا ہوا قُم قُم۔

میں نے اُس کی بانہہ پکڑ کر کہا، "گھر چلو —— روپ! جیتے جی تم نے مجھے اپنے ساتھ نہ رہنے دیا۔ اب موت کے چند لمحے تو بخش دو۔"

وہ مسکرائی۔ بولی: "تم نہیں جانتے؟ محبت زندگی میں اور موت میں بھی یکساں سلوک کرتی ہے!"

گاڑی نے سیٹی دی۔

وہ بولی: "مجھے امید نہ تھی تم کبھی ملو گے! افسوس ہے کہ میں یہاں رُک نہیں سکتی، ہاں یہ کتاب تمہیں دے سکتی ہوں، اکیلے کی نظمیں۔"

گارڈ نے جھنڈی دکھائی۔

وہ اپنے ڈبے کی طرف چل دی، میں اُس کے چہرے کی طرف نہ دیکھ سکا۔ میری آنکھیں پھر اس کے پاؤں پر گڑ گئیں، وہ پاؤں چلتے گئے، چلتے گئے،

دور جاتے ہوئے بھی گویا قریب آتے گئے، بالکل میرے سینے پہ آ گئے،
اور میں نے انہیں اٹھا کر اپنے سینے کے اندر چھپا لیا۔۔۔۔
میں نے نگاہ اٹھائی۔
گاڑی جا چکی تھی۔

محبوبہ ابھی تک میری راہ دیکھ رہی تھی۔ بولی "کہاں چلے گئے تھے"
میں چپ ہو رہا۔
"یہ کونسی کتاب ہے؟"
"الکے کی"
"کیا؟"
"ایک شاعر کی نظمیں ہیں"
"مجھے سناؤ۔ کیا کہتا ہے یہ؟"
میں نے کتاب کھولی، پندرھواں صفحہ آنکھوں کے سامنے آیا۔ آہستہ سے پڑھنا شروع کیا "اے خدا تو نے زندگی اپنی مرضی کے مطابق دی۔ اب موت تو میری مرضی کے مطابق بخش دے۔ تجھ سے اور کچھ نہیں چاہتا ہوں خداوند!"

"پھر موت!" وہ بولی: "بُرا شگون ہے۔" اس نے کتاب میرے ہاتھ سے چھین کر الگ کر دی، اور اپنے لب میری طرف بڑھا دیئے۔ غالیچہ اُبل رہا تھا۔ بالکل آگ تھا۔ شعلوں کا دریا۔ پیپ کا سمندر، زہر کا کھولتا ہوا گرم چشمہ۔ میں نے اُس سے پوچھا "تم صلیب ہو، تم نے آدمی کے بیٹے کو مسیحا بنا دیا۔ بتاؤ مجھے کیا بناؤ گے۔"

غالیچے نے کہا۔ "جو تم خود بن چکے ہو، اک اہرام ـــ اک کھوکھلا اہرام جس کے سینے میں ممیاں دفن ہیں۔"

میں نے اپنی محبوبہ سے کہا "میرا جی چاہتا ہے۔ اس غالیچے کو جلا کر خاک کر ڈالوں۔"

وہ بولی۔ "ہاں! پرانا تو ہو گیا ہے۔"

"لیکن" میں نے رک کر افسردہ لہجے میں کہا ـــ "میرے پاس تو یہی ایک، غالیچہ ہے۔ اور یہی ایک زندگی ہے۔ نہ اسے بدل سکتا ہوں نہ اُسے ۔۔۔!!!"

یہ کہہ کر آرٹسٹ گتا چوسنے لگا۔

ایک ایکسٹرا لڑکی

یہ گیارہ دسمبر ۱۹۴۴ء کی دوپہر کا واقعہ ہے۔ میں کھانا کھا کر اپنے دفتر کی میز پر سر ٹیکے اونگھ رہا تھا کہ کمرے میں ایک ایکسٹرا لڑکی داخل ہوئی۔ یوں تو ایک ہیروئن اور ایک ایکسٹرا لڑکی میں وجہ تفریق کی بہت سی باتیں ہیں لیکن ایک موٹی سی بات جو میرے ایسے کند ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی ہیروئن اس طرح میرے کمرے میں داخل نہیں ہو سکتی۔ جب ہیروئن یا کوئی اہم کردار ادا کرنے والی ممثلہ کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ کسی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ تو اس کمرے میں تین چار آدمی اس کی پیشوائی کے لئے ضرور موجود رہتے ہیں، اس کی آمد کی خبر پہلے سے کر دی جاتی ہے۔ اور اگر کسی کند ناتراش

کا سر میز پر اونگھتا ہوا نظر آ جائے تو اسے ٹھوکے دے کر پہلے ہی سے
خبردار کر دیا جاتا ہے ”ہوشیار باش، ممتلہ آ رہی ہے“ اور چونکہ اس دوپہر
کو اس قسم کا کوئی واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔ اس لیے یقیناً وہ لڑکی جو گیارہ
دسمبر ۱۹۴۴ء کی دوپہر کو میرے کمرے میں داخل ہوئی اکسٹرا لڑکی تھی۔

اس لڑکی کا نام زبیدہ تھا۔ وہ ہنس کر مجھ سے کہنے لگی کہ گھر والے اسے
”زیب“ ”زیب“ کہہ کر پکارتے ہیں۔ میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس طرح
کہنا کچھ گھر والوں ہی کو زیب دیتا ہے۔ بہر حال ”زیب“ نام کی ایک
اور لڑکی کو بھی میں جانتا ہوں۔ لیکن اس کی کہانی پھر کبھی لکھوں گا، کیونکہ
اُس کے ڈرامے میں حرف سوالیہ ابھی آیا ہے۔ اور اس زیب کے افسانے
میں حرفِ سوالیہ آ کر گذر گیا ہے، یہ حرفِ سوالیہ بھی زندگی میں کئی ڈھنگ سے
آتا ہے، کبھی تو یہ محبوب کے بوسے کی طرح شہد آگیں ہوتا ہے۔ اور کبھی
ناکام تمناؤں کی طرح تلخ، کبھی اس کی تشکیل سرخ انگاروں سے ہوتی
ہے، اور کبھی آنسوؤں کے نمکین پانی سے، لیکن ہر زندگی میں ایک بار
تو یہ حرفِ سوالیہ ضرور آتا ہے، یہ بڑا دلچسپ مرحلہ ہوتا ہے، زیب یعنی
وہ زیب نہیں جس کی کہانی میں اب لکھ رہا ہوں، بلکہ وہ زیب جس کی

کہانی میں پھر کبھی لکھوں گا۔ ابھی اس مرحلے میں سے گزر رہی ہے، اور میں بحیثیت ایک تماشائی کے اسے کسی قسم کا مشورہ نہیں دینا چاہتا، اس سے صرف توقع کرتا ہوں کہ اگر کبھی یہ سطور اس کی نظر سے گزریں تو وہ مسکرا کر خاموش ہو جائے۔ اور اگر نہ مسکرائے تو اور بھی بہتر ہو گا۔

زبیدہ نوکری کی تلاش میں آئی تھی، اور سٹوڈیو کے مالک نے غالباً مجھے سب سے بے ضرر اور رنجان مرنج آدمی سمجھ کر اس کام پر تعینات کیا تھا کہ میں اکسٹرا مردوں اور اکسٹرا عورتوں کی شکل وصورت اور ان کی اداکاری کے امکانات کا صحیح جائزہ لوں، یہ اندازہ اس نے میرے گنجے سر، دبیز عینک، اور اس بے اعتنائی سے لگایا تھا جس کا مظاہرہ میں اکثر صنفِ نازک کے سامنے کیا کرتا ہوں۔ اسے کیا معلوم کہ یہ تو محض اک مدافعتی حربہ ہے، ورنہ میری جلد کے نیچے بھی وہی تیز لہو دوڑتا ہے۔ اور احساسات کے ہیولاؤں میں وہی جنسی آگ شعلہ زن ہے، اور ٹھنڈی یخ، برفیلی نگاہوں کی بدلیوں میں بجلیوں کے کوندے مستور ہیں، شاید وہ سب کچھ سمجھتا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی جانتا ہے کہ میں اس قدر کمزور ہوں کہ اپنی جھوٹی شرافت کے خول کو توڑنے کی سکت بھی مجھ میں نہیں۔ اس لیئے میں درحقیقت بے ضرر

ہوں۔ یہ حقیقت بڑی تکلیف دہ ہے اور داستان بیان کرتے وقت کچھ زیادہ
ہی معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تکلیف دہ ہونے کے بجائے
یہ میرے لئے اکثر وجۂ مسرت بن جاتی ہے اور میں اس جھوٹی شرافت کے
سرچشمے سے اپنے لئے کئی بار احساس برتری مستعار لے لیا کرتا ہوں۔ تم
نہیں سمجھو گے۔ لیکن وہ زیب ــــ میرا مطلب ہے وہ زیب ضرور سمجھ جائے
گی جس کے لئے میں یہ کہانی نہیں لکھ رہا ہوں۔

ہاں تو زبیدہ اُس دوپہر کو مرے کمرے میں ملازمت حاصل کرنے
کی غرض سے داخل ہوئی۔ زبیدہ چھٹی لڑکی تھی جس سے اُس روز مجھے انٹرویو
کرنا پڑا۔ سب سے پہلے جو لڑکی آئی تھی، وہ اپنے دو بھائی بھی ساتھ لائی تھی،
ایک کا نام بے بی لنگرے تھا، اور دوسرے کا نام جانی لاپو، وہ گجراتی لڑکی
تھی۔ پرانی کمان کی طرح ڈھیلی ڈھالی، ناک نقشہ، چال ڈھال، بات چیت
میں ایک غیر معین ناہمواری، بے دلی، بے سلیقگی، ایسا معلوم ہوتا تھا، یہ عورت
ابھی ابھی گیلی مٹی سے بنائی گئی ہے، اور اس کے فوراً بعد ہی میرے کمرے
میں انٹرویو کے لئے دھکیل دی گئی ہے، میں نے اُسے ملازمت دینے
سے انکار کر دیا۔

اُسے کہا، "آپ کا پتہ میں نے نوٹ کر لیا ہے۔ جب ہمیں کسی فلم میں آپ کی ضرورت ہوگی۔ آپ کو ضرور بلا لیا جائے گا۔" دل میں کہا۔ جاؤ۔ آفتاب کی کرنوں میں غسل کرو۔ زندگی کے جھونکوں سے اپنی شخصیت کو نکھرانے دو۔ جب یہ گیلی مٹی سوکھ جائے گی۔ پھر یہاں آنا۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُس کی گیلی مٹی کبھی نہ سوکھے گی "میرا پتہ ــــ میرا پتہ آپ نے نوٹ کر لیا ہے نا۔"

"ہاں۔ ہاں نوٹ کر لیا ہے۔"

"اچھی طرح نوٹ کر لیا ہے نا۔ للو بھائی سارا بھائی لین، مکان نمبر ۴۵۰/۵۲۲۔ مکان نمبر ۴۵۰/۵۲۲ نہ بھولئے گا۔ شہر احمد آباد۔ ۔ ۔ ۔"

"گھبرائیے نہیں۔ آپ کا پتہ میرے پاس بالکل محفوظ ہے۔"

"تو آپ مجھے ضرور بلائیں گے نا۔"

"ضرور ــــ تسلی رکھیئے۔ نہ بلانے کی کوئی وجہ نہیں۔"

"اچھا تو ــــ وہ میرا پتہ۔"

"نمستے۔" میں نے ہات جوڑ کر جلدی سے کہا۔

وہ اُلٹے پاؤں ہات جوڑ کر کمرے سے باہر آہستہ آہستہ نکلتی گئی گیلی

مٹی تھی۔ چل بھی نہ سکتی تھی۔ اچھی طرح سے جاتے ہوئے چوکھٹ سے ٹکرا گئی۔ پھر نظروں سے غائب ہو گئی۔ کون کہتا ہے غائب ہو گئی۔ ابھی تک میری نگاہوں میں محفوظ ہے۔ اس کمرے کی میز پر اس فرش پر، اس چوکھٹ پر، اس دروازے کے شیشوں پر اُس گیلی مٹی کے نشان ہیں۔ دیکھنے والا دیکھ سکتا ہے۔

دوسری لڑکی بدھوار پیٹھ پُونا سے آئی تھی۔ پُونا سے بمبئی آئی تھی گلابی رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی اُس کے جسم سے چپکی ہوئی تھی، اور اس کے اندر سے اُس کا جسم اک خشک تنے کی طرح نظر آرہا تھا، اُس کی نگاہیں ویران تھیں، اُس کے لب ویران تھے، اور اس کا سینہ ویران تھا، وہ اک لٹے ہوئے شخص کی طرح آکر میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس طرح بیٹھ گئی گویا کہہ رہی ہو۔ میں جانتی ہوں تم مجھے ملازمت نہیں دو گے میں جانتی ہوں مجھ میں رس، شعریت نہیں، نسائیت، نہیں، پھر بھی میں تمہارے پاس آئی ہوں۔ کیا اس بے حیائی، ڈھٹائی "کوئی امید بر نہ آئی" کی بھی داد نہ دو گے۔

میں نے دل میں کہا۔ مطلق نہیں۔ اور اُس سے پوچھا "تمہارا نام؟"

"کوشلیا۔"

"تم بدھوار پیٹھ پونا سے آئی ہو۔"

"ہاہو"

"ہاہو؟" — میں نے کہا، "تم امرتسر کی رہنے والی معلوم ہوتی ہو۔"

"خوب پہچانا تم نے!" اُس نے ہنس کر کہا۔ اور اس کے سیاہی مائل زرد دانت جبڑوں میں اکھڑی ہوئی جڑوں کے سروں کی طرح دکھائی دینے لگے۔

"پہلے کسی تصویر میں کام کیا ہے۔"

"ہاہو! 'حکم دا یکہ'، 'تے جادوگر باج بہادر' ہور 'چٹ پٹ منگنی'۔ میں گاتی بھی ہوں، بدھوار پیٹھ میں اپنا کوٹھا ہے۔ کبھی آؤ وہاں۔"

میں نے پوچھا۔ تم امرت سر سے پونا کیسے آگئیں۔"

"رزق!" اُس نے آہستہ سے کہا۔ بے دلی سے کہا، بے رس، بے جان، بے نور لہجے میں کہا۔ اُس کی نگاہوں میں، اس کے جسم میں، اس کی روح میں، تاریکی ہی تاریکی تھی اور اُسے دیکھ کر ایک کراہت آمیز نفرت کا احساس میرے دل میں بڑھتا چلا آرہا تھا۔ شاید وہ عورت نہ تھی، تاریک گندے گدلے پانی میں پیدا ہونے والی جونک تھی جو میری میز پر دھری تھی۔ اور آہستہ آہستہ

میری طرف رینگ رہی تھی۔

"جاؤ، جاؤ۔۔۔۔" میں نے چلّا کر کہا۔

وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اس سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔ "دراصل بات یہ ہے کہ ابھی فلم کے شروع ہونے میں دو ماہ باقی ہیں۔ ہمیں یقیناً آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی اور بھی بہت سی لڑکیاں۔۔۔۔۔"

وہ میری بات کاٹ کر بولی، میری چھوٹی بہن گومتی — بھی میرے ساتھ آئی ہے۔۔۔۔ او گومتی ادھر آ۔"

بڑی جونک، چھوٹی جونک! اس سے چھوٹی جونک۔۔۔۔

"ہاں آپ کو اور آپ کی بہن کو بھی ضرور بلاؤں گا۔ فی الحال تو — اچھا نمستے۔"

"یہ میرے فوٹو ہیں۔" اس نے اٹھتے ہوئے اپنی گلابی ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے کہا۔ "ہور پونا کدی آؤ تو ہمارے کوٹھے ضرور آنا۔"

وہ دونوں چلی گئیں، بڑی جونک، چھوٹی جونک۔۔۔۔۔!

تیسری لڑکی مراٹھی تھی، مراٹھی لڑکیوں کے بدن میں بالعموم اک دلکش تناؤ ہوتا ہے اور آنکھوں میں اک بے بس ہرنی کی سی معصومیت ہوتی ہے۔ جسے

مرد بالعموم بہت پسند کرتے ہیں، لیکن یہ لڑکی بے بس ضرور نظر آتی تھی، لیکن ہرنی نہیں۔ نگاہوں میں تناؤ ضرور تھا ....
لیکن جسم میں اس حقیقت کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کچھ عجیب بے ڈھنگی سی۔ لگر ملگڑ یا چرخ کی سی چال چلتی ہوئی اندر آئی، اس کے ساتھ اس کا خاوند تھا۔ جو کمرے میں داخل ہوتے ہی دانت نکال کر مسکرانے لگا۔ اور جب تک کمرے میں رہا۔ اسی طرح مسکراتا رہا۔ خدا جانے یہ کمرے کی فضا کا اثر تھا یا میری صورت کا، یا اُس خوش آئند تصویر کا جو اُس کی بیوی کے مثلہ بن جانے کی صورت میں اُس کے مستقبل کی ہوتی۔ شاید اُس کی مسکراہٹ اُس حرفِ سوالیہ کا جواب تھی جو آج اس بدنصیب جوڑے کے مقدر میں لکھا جا رہا تھا۔ اکثر اوقات آدمی کو معلوم بھی نہیں ہوتا۔ کہ حرفِ سوالیہ اُس کے سامنے ہے، اور اُس سے زندگی کا، اس کی اہمیت کا، اُس کے تواتر کا، اس کے بنیادی اخلاق کا جواب طلب کر رہا ہے، وہ یہ سب کچھ نہیں جانتا اور یونہی احمقانہ طریق پر مسکرائے جاتا ہے، یہ آدمی یہی کر رہا تھا۔ بیس سال بعد جب یہ گنجا ہو جائے گا۔ اور اس کی آنکھوں پہ دبیز عینک چڑھی ہوگی میری طرح روئے گا، مسکرانے دو ابھی اسے۔ . . .

"یہ میرا بیوی ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "نوکری کرنے ہوتا۔"

"ہندی یا اُردو جانتی ہے؟"

ہو۔ پھار چانگلا..... (بہت اچھا!)

میں نے کہا۔ "اچھا تو لکھو...... ایسے میں اُس کلموہی کے گھر کیوں......"

ناہیں... ناہیں۔ لکھنے کو نہیں مانگتا۔ میرا بیوی زبانی یاد کرتا۔ تم اس کو بتاتا۔ یہ اکٹرے..... پھار چانگلا۔"

میں نے کہا۔ "اچھا تو کہو۔ شب چراغ"

"شب چراگ"

"شب چراگ نہیں۔ شب چراغ"

"شب چراگھ"... یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

میں نے پوچھا۔ "یہ ہنستی کیوں ہے۔"

وہ اپنی بتیسی کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔ "ایہہ.... ہمارے بولی میں اس کو "گالی" بولتا۔ بڑا گالی۔"

"پھار چانگلا!" میں نے خوش ہو کر کہا۔ کہو..... "شب چراغ"

"نہیں.... نہیں...." وہ اب شرما گئی۔ شرماتے وقت اتنی

اتنی بے وقوف اور احمق معلوم ہونے لگی وہ . . . .

"پہلے کسی تصویر میں کام کیا؟" میں نے بات کا رُخ پلٹتے ہوئے کہا

"نا ہیں، نا ہیں۔ ہمارا بیوی کدھر کام نہیں مانگتا۔ ام شریف لوک لائے اکڑے ہنکٹے،" ام بولا۔ اس کمپنی کا لوگ بوہت اچا، اس کو مشکل سے راجی کرتا۔ میرا بیوی بولتا۔ تم امارے ساتھ ہوتا تو ہم کام کرتا ہو، ام بولا۔ چار چانگلا ام بھی تمہارے سنگ کام کرتا۔ ام اس کے سنگ اتی پریم کرتا۔"

"چار چانگلا!" میں نے اُس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارا پتہ میں نے نوٹ کر لیا ہے۔ آخر میں میں نے اس جوڑے سے کہا۔ ۵۸ کالبا دیوی لین، پُورانا مندر، بمبئی۔ ۱۹ میں ہے نا۔ بہت جلدی تمہیں بلانے کی کوشش کرونگا"

وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتا رہا۔ میں نے اپنا جواب دہرایا۔ وہ پھر بھی مسکراتا رہا میں نے انہیں رخصت کرنے کے لئے ہات بڑھایا۔ اس نے ہات جوڑ دیئے۔ اور مسکراتا رہا۔ اُس کے کوٹ کا کالر تین جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اُس لڑکی کی دھوتی گو گھر کی دھلی ہوئی تھی۔ لیکن سخت بوسیدہ تھی۔ اُٹھتے وقت مجھے یہ باتیں معلوم ہوئیں۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ وہ سچ مچ بے بس

ہرنی تھی۔ اُس کی نگاہیں زمین پر گڑ گئیں اور اس کا خاوند مسکراتا رہا۔ واپس جاتے ہوئے، میری طرف دیکھتے ہوئے برابر مسکراتا رہا۔ اور جب وہ میرے کمرے کے باہر چلا گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ ہنسی نہ تھی، یہ رونا تھا۔ اُس کی شرافت بھی میری طرح جھوٹی تھی اور جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ اور وہ اس میں تبسّم کا پیوند لگا کر اپنی غربت کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف، اپنی بیوی کو بیچنے آیا تھا، اور مسکرا رہا تھا۔ اور اُس کی مسکراہٹ میں انسانیت کا خون تھا، یہ باتیں میں اب تم سے بیان کر رہا ہوں، ورنہ اس وقت تو میں نے اُس سے صرف یہ کہا تھا۔ میں تمہیں ضرور بلانے کی کوشش کرونگا، یہ جھوٹ ضرور تھا۔ کیونکہ وہ دونوں خاوند بیوی کسی ہندوستانی فلم میں کام کرنے کے لئے قطعی ناموزوں تھے۔ لیکن یہ ایک معمولی سا جھوٹ تھا۔ اتنا معمولی جتنا اس آدمی کا تبسّم، ایک سیدھا سادا عام جھوٹ ایک جھوٹے آدمی نے دوسرے جھوٹے آدمی سے جھوٹ بولا۔ بس اور کیا۔

پانچویں لڑکی نہ تھی، ادھیڑ عمر کی عورت تھی، تین بچوں کی ماں، دو لڑکیاں ایک لڑکا۔ بیوہ اور فربہ اندام، اور گلا بھاری، خوشرنگ، آتے ہی پھسکڑا مار کر کرسی پر بیٹھ گئی، پھر بیڑی نکال کر سلگانے لگی۔ لولی "کمپنی نے کاہے کو

اشتہار دیا ہے۔"

"اکسٹرالڑکیوں کی ضرورت ہے۔"

"ہاہاہا" وہ بیڑی کا دھواں میرے چہرے پر بکھیرتے ہوئے بولی۔

"کتنے روپے دوگے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے کہا "تم نے کہیں کام بھی کیا ہے۔ یا یونہی؟"

وہ بولی "بیٹا، ساٹھ تصویروں میں کام کیا ہے۔ ساٹھ تصویروں میں ہیروئن رہ چکی ہوں، آنند بالا کا نام نہیں سنا؟"

وہ مسکرانے لگی "اچھے تاجر ہو" بولی، خیر مجھے کیا لینا دینا، گھر میں کھانے پینے کو بہت ہے، اس لئے چلی آئی تھی کہ اگر کام اچھا ہو، میرے ڈھب کا ہو تو کرلوں گی، ورنہ ــــ اب یہ چھوٹے موٹے دو سطروں کے پارٹ تو مجھ سے کئے نہیں جاتے۔۔۔۔ بولو پارٹ اچھا ملے گا؟"

"بہت اچھا۔"

"کتنے سین ہوں گے؟"

"کوئی آٹھ دس۔ ٹھیک طرح سے نہیں کہہ سکتا۔"

"کتنے دن کا کام ہے؟"

"آٹھ دس دن کا کام ہے۔"

"بس؟"

"بس!"

"اچھا تو کر لوں گی۔ مگر بابا روپے کتنے دو گے۔"

"پچھتر روپیہ ماہوار۔"

"بس؟"

"بس!"

"یہ تو بہت کم ہے بابا۔ میرے بچے ہیں۔ دو لڑکیاں۔ ان کا بیاہ مجھے کرنا ہے۔ کچھ تو سوچو اور ——"

ملمع اُترنے لگا۔ اور جب وہ چلنے لگی تو بالکل ہی اُتر چکا تھا۔

چھوٹی لڑکی کا نام زبیدہ تھا۔ جسے گھر والے زیب کہہ کر پکارتے تھے۔ خیر یہ کوئی بڑی بات نہ تھی، وہ کنواری تھی، کم از کم اُس کا بیاہ نہ ہوا تھا۔ زبیدہ کا جسم جوان تھا، اُس کی آنکھیں جوان تھیں، اُس کے ہونٹ جوان تھے، اس کی مسکراہٹ جوان تھی، اس کا ماتھا گھٹا ہوا تھا۔ اس کی ناک میٹھی

ہوئی تھی، اُس کا رنگ کالا تھا، وہ ایک ایسی لڑکی تھی، جو بدصورت ہوتے ہوئے بھی بدصورت نہ تھی اور خوبصورت ہوتے ہوئے بھی خوبصورت نہ تھی، اُس کے جسم کے خطوط میں، اور اُس کے آہنگ میں، اور اُس کے نغمے میں شمال اور جنوب کے قطبین کی آمیزش تھی، آریائی خون دراوڑ جلد میں لہریں لے رہا تھا، اور دراوڑی حدت آریائی برف کو پگھلا کر اسے پانی کی طرح پگھلا رہی تھی، اس وجہ سے تو زبیدہ کے جسم کا اور اس کی روح کا صحیح تجزیہ نہ ہو سکتا تھا۔ وہ اک مسلسل تجربہ تھی، جیسے دو نسلیں، دو تہذیبیں، دو زمانے، ایک سانچے میں کھولا رہے تھے، اسی لئے تو وہ خوبصورت تھی نہ بدصورت، جوان تھی نہ بڑھیا، کالی تھی نہ گوری، آریائی تھی نہ دراوڑی، کبھی تو اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور روشن معلوم ہونے لگتیں، اور وہ خوبصورت معلوم ہونے لگتی، دوسرے لمحے میں اس کی آنکھیں چھوٹی اور اس کا ماتھا گھٹا ہوا معلوم ہوتا۔ کبھی تو اُس کی جلد میں آریائی اجلاپن نظر آتا، دوسرے لمحے میں کالی ناگن کی سیاہ لطافت اُس کی جلد میں عود کر آتی، اور بیٹھی ہوئی ناک کے نتھنے خوفناک پھنوں کی طرح پھڑکنے لگتے۔

"زبیدہ۔ کہاں کی رہنے والی ہو"

"بمبئی کی"

"باپ کیا کام کرتا ہے"

"ایک سوڈا واٹر کی دکان ہے اس کی، اور میری ماں ایک پارسی کے ہاں ملازم ہے"

"اور انہیں تمہارے ـــــ میرا مطلب ہے ـــــ اگر تم ـــــ فلم میں کام کرو تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا"

"مطلق نہیں صاحب!"

"تم اُردو بہت اچھا جانتی ہو"

"شکریہ۔ مجھے غزلوں کا بہت شوق ہے۔ میرا باپ بڑا عالم فاضل ہے۔ میرے پاس مینائی، جگر، غالب، داغ سب کے دیوان موجود ہیں"

"جوش کا کلام دیکھا ہے"

"نہیں"

"کرشن چندر کے افسانے پڑھے ہیں"

"نہیں، مجھے افسانوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے بس غزلوں کا شوق ہے"

داغ آہا۔ کیا کہتا ہے۔ اور جگر! واہ وا.....‘‘

’’تم نوکری کیوں کرنا چاہتی ہو؟‘‘

’’مجھے فلم میں کام کرنے کا بہت شوق ہے۔‘‘

’’فلم میں کام کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔‘‘

’’واہ۔ اس میں کیا مشکل ہے۔ میک اپ کیا اور کیمرے کے سامنے آگئے واہ۔ اس میں کیا مشکل ہے۔‘‘

’’کبھی کام کیا ہے۔‘‘

’’نہیں۔ مگر شوق ہے۔ مجھے غزلوں کا بڑا شوق ہے۔ آپ غزلیں کہتے ہیں؟‘‘

’’نہیں۔ میں غزلیں نہیں کہتا۔ سنتا ہوں۔ سناؤ گی؟‘‘

’’واہ ــــ میں غزلیں کیوں سناؤں گی بھلا۔ میں شعر تو نہیں کہتی۔ دوسروں کے کہے ہوئے پڑھتی ہوں۔ مجھے تم کوئی پارٹ دو نا۔ کیا نام ہے تمہارا۔‘‘

’’جانی واکر۔‘‘

’’جانی واکر! چھی چھی چھی۔ جانی واکر بڑا بُرا نام ہے۔‘‘

’’تمہیں کیسے معلوم ہے۔‘‘

’’میں جانتی ہوں۔ یہ ایک شراب کا نام ہے۔ اچھے آدمی شراب نہیں

پیتے۔ مجھے جگر کی غزلیں بہت پسند ہیں۔"

"جگر شراب نہیں پیتا۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہے؟"

"مجھے مہتاب نے بتایا تھا۔ میں ایک روز مہتاب سے ملنے گئی تھی، بچاری اچھی طرح ملی۔ چائے پلائی، اتنی بڑی ایکٹرس ہے وہ، پر غرور —— چھی چھی چھی —— نجانے بڑی بڑی فلم ایکٹرسوں کو غرور کس بات کا ہوتا ہے کیوں جی؟ اور میں نے دیوکا رانی کو ٹیلی فون کیا اُس نے جواب نہیں دیا۔ کیوں جی؟ یہ کیا بات ہے۔ واہ...."

میں اُس کی ساڑھی کی طرف دیکھنے لگا۔ دھوبی کے ہاں دھلی ہوئی تھی۔ سفید وائل کی ساڑھی جس پر طاؤسی نقش ونگار کا بارڈر تھا۔

میں نے کہا۔ "بارڈر اچھا ہے۔"

وہ بولی۔ "شکریہ..... مجھے معلوم ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہے۔ جگر نے بتایا تھا۔ کہ مہتاب نے، کہ دیوکا رانی نے۔"

وہ بولی "چھی چھی چھی۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آتی۔"
یہ کہہ کر اُس نے اپنا ہات میرے ہات پر رکھ دیا۔ "لایئے میں آپ کا ہات دیکھوں"
میں نے اپنا ہات اُس کے ہات میں دیدیا۔ دونوں ہاتھوں میں بہت سی باتیں ہوئیں، محبت کی باتیں، وصال کی باتیں، جسم کی لذت کی باتیں ہمیشہ ہمیشہ زندہ اور جوان رہنے کی باتیں، سب جھوٹی باتیں، میں بھی سمجھتا تھا، وہ بھی سمجھتی تھی۔ آخر اُکتا کر کہنے لگی۔ "مجھے نوکری چاہیئے۔"
میں نے کہا۔ "میں نے تمہارا پتہ نوٹ کر لیا ہے اور ——"
وہ بولی۔ "مجھے کل تک جواب دو۔"
اس کے بعد وہ دوسرے دن آئی۔ تیسرے دن وہ آئی۔ چوتھے دن وہ آئی، پندرھویں دن وہ آئی۔ ہر بار اس کے ہات میں اک نئی کتاب ہوتی، کسی پُرانے شاعر کا کلام، مطبع نولکشور، لکھنؤ، پرانی کتابیں جن سے سوندھی سوندھی خوشبو آتی تھی، پرانے کاغذوں کی خوشبو، پرانے زمانوں کی پُرانی جوانیوں کی، پرانے آنسوؤں کی خوشبو، اور ہر بار اُس کے بدن پر وہی ساڑھی ہوتی، دھوبی کے ہات سے دھلی ہوئی اور وہی طاؤسی بارڈر، اور وہی غزلیں، بار بار پڑھ کر مجھے سناتی تھی وہ، اور ہر روز نوکری کے لئے التجا

کرتی۔ یونہی، باتوں باتوں میں سرسری طور پر، ایک دفعہ کہہ دیتی، اور پھر دیوان کے ورق اُلٹ کر مجھے سنانے لگتی، جیسے نوکری سے زیادہ اسے ان شاعروں سے عشق ہے،

ایک دن میں نے کمپنی کے مالک سے کہا۔ "ایک ایکسٹرا لڑکی آئی ہے نام ہے زبیدہ، تلفظ اچھا ہے۔ گو ناک میں بولتی ہے، مگر چل جائے گی۔"

"شکل وصورت کیسی ہے۔"

"بس یونہی جیسے ایکسٹرا لڑکیوں کی ہوتی ہے، مگر ذہین معلوم ہوتی ہے۔ اس کا باپ بڑا "عالم فاضل" ہے۔ اس کی ماں اک پارسی کے ہاں ملازم ہے"

"کون ہے وہ؟"

میں نے کہا۔ "طوائف تو نہیں معلوم ہوتی۔ نیم طوائف شاید ——"

"جانے دو!"

میرے انکار کرنے کے بعد بھی وہ آتی رہی۔ کسی نے اُسے بتایا کہ سعید اسے نوکر کرا سکتا ہے۔ وہ سعید کے پاس گئی، کسی نے اُسے بتایا کہ جمیل سے اس کا کام ہو سکتا ہے، وہ جمیل کے پاس گئی، کسی نے بتایا کہ لال اُس کا کام کر دے گا، وہ لال کے پاس گئی۔ اور پھر ہر پھر کر میرے پاس آئی۔ اب

وہ سارے سٹوڈیو میں بدنام ہو چکی تھی، کیونکہ وہ نوکر ہونا چاہتی تھی۔ اور اسے نوکری حاصل کرنے کا ڈھنگ نہ آتا تھا۔ وہ اس بے حیائی کے انداز میں کہہ رہی تھی۔ مجھے لے لو ــــ مجھے لے لو ــــ کہ کوئی اُسے لینے کے لئے تیار نہ تھا۔

میں نے اُسے دیکھتے ہی تیوری چڑھالی۔ میں اُس کی مسلسل آمدورفت سے عاجز آچکا تھا۔ اور اُس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔

"زیب!"

"جی!"

"تم گھر جاؤ۔ اور یہاں کبھی نہ آؤ۔"

"بہت اچھا۔"

"جب تمہاری ضرورت ہوگی تمہیں بلا لیا جائیگا۔"

"بہت اچھا۔"

"زیب!"

"جی!"

"تمہارا اس طرح خوشامد کرنا مجھے...."

میرا فقرہ نا تمام رہ گیا۔ کیونکہ وہ رو رہی تھی۔

وہ روتی رہی اور میں میز پر بیٹھا ہوا اپنی انگلیوں سے طبلہ بجاتا رہا جب وہ چپ ہو گئی تو مسکرا کر کہنے لگی "یہ شعر آپ کو پسند ہے۔

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں تیرا رہگذر یاد آیا"

میں نے کہا "غالب کا شعر ہے!"

وہ بولی "اور مجھے یہ شعر بھی بہت پسند ہے۔

ہم نے بھی وضع غم بدل ڈالی
جب سے وہ طرزِ التفات گئی

میں نے کہا "جگر کا شعر ہے"

وہ بولی "میں جاتی ہوں، خدا حافظ"

"خدا حافظ!"

زبیدہ چلی گئی۔ اُس نے اپنی وضع غم بدل ڈالی، اب وہ ایک فلمی دلال بادامی کے پاس ہے، بادامی اُسے ایک بہترین فلم ایکٹرس بننے کے سارے لوازم بہم پہنچا رہا ہے، اب تک وہ تین چار لڑکیوں کو فلمی ستارے بنا چکا ہے

بادامی ہر سال ایک لاکھ روپیہ انکم ٹیکس ادا کرتا ہے، اس کا کام ہے نئی لڑکیوں کو فلم ایکٹرس بنانا اور پھر انہیں بیچنا۔ وہ کہتا ہے۔ یہ بڑی اچھی تجارت ہے، ملک میں یہ تجارت اب پانچویں نمبر پر ہے، بادامی نے زبیدہ کو زندگی کے نازک ترین مرحلے سے بخیر و عافیت گزر جانے کا موقع دیا۔ وہ اس کے لئے شکر گزار ہے، امسال زبیدہ بادامی کے ساتھ سندھ اور پنجاب میں ایک ناچ پارٹی میں دورے پر جا رہی ہے، پچھلے سال بادامی نے اسی دورے میں تین لاکھ روپیہ اکٹھا کیا تھا۔ اب زبیدہ بھی اس کے ساتھ ہے۔ اسے زیادہ آمدنی کی توقع ہے۔

زبیدہ اگلے سال فلم سٹار بن جائیگی۔ پھر وہ اپنی آمدنی کا تیس فیصدی بادامی کی نذر کیا کرے گی، کالج کے لڑکے اس کے گھٹے ہوئے ماتھے، بیٹھی ہوئی ناک، اور گنگنے اندازِ تکلم پر قربان ہوا کریں گے، اور اس کی تصویریں اپنے البم میں سجائیں گے، اور چاندنی راتوں میں آہیں بھرینگے۔ اور جس کمپنی کے مالک نے اُسے اپنے ہاں پچھتر روپے کی نوکری دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اب اُسے دس ہزار روپے دے کر اپنی نئی تصویر میں کام کرنے کی دعوت دے گا۔

اور اخباروں میں زبیدہ کی تصویریں چھپیں گی، اور لوگ اُسے گالیاں دیں گے اور لوگ اسے بے وفائی، بے حیائی، ننگِ انسانیت کے حوصلہ افزا خطابات سے نوازیں گے۔

یہ سب کچھ ہوگا اور بہت کچھ ہوگا، اور خوب ہوگا، اور محض اس لئے ہوگا۔
کہ گیارہ دسمبر ۱۹۴۴ء کی دوپہر کو میں نے اور تم نے ایک عورت کو مار ڈالا تھا
اور ایک طوائف کو جنم دیا تھا۔ گیارہ دسمبر ۱۹۴۴ء کی دوپہر کو میں نے اور تم نے
سورج کو ڈوب جانے دیا تھا اور تاریکی کو بچا لیا تھا، گیارہ دسمبر ۱۹۴۴ء کی
دوپہر کو میرے اور تمہارے سامنے ایک حرفِ سوالیہ آیا تھا۔ اور اس کے
جواب میں میں نے اور تم نے چھ لڑکیوں کے چہروں پر کیچڑ تھوپ دی تھی۔
کیونکہ زبیدہ ایک لڑکی نہ تھی، وہ چھ لڑکیاں تھیں، چھ نہیں بلکہ سات،
کیونکہ ان باتوں میں وہ زبیدہ یعنی وہ زیب بھی شامل ہے جس کا اس کہانی
سے کوئی تعلق نہیں۔

پھانسی کے سائے میں

زندگی کے آخری لمحے کیوں بُرے معلوم ہوتے ہیں. شاید اس لئے کہ محض جینا ہی کافی ہے. محض جینا ہی خوبصورتی ہے، .... مجھے فیروز ڈاکو کے آخری لمحے یاد آتے ہیں۔ ان دنوں میں کالج میں پڑھتا تھا، اور گرمیوں کی چھٹیوں میں ایک دوست کے ہاں رام گڑھ جا رہا تھا۔ تھرڈ کلاس کے ڈبے میں بہت بھیڑ تھی، بڑی مشکل سے مجھے کھڑے ہونے کی جگہ ملی، لمبا سفر تھا کئی گھنٹے اسی طرح کھڑے کھڑے گزر گئے، میرے قریب کی بنچ پر دو ننھی ننھی لڑکیاں بیٹھی تھیں اور اُن کے ساتھ ان کا بھائی جس کی عمر بمشکل آٹھ نو سال کی ہو گی، ان سے پرے ان کی ماں بیٹھی تھی، اس سے پرے پھر دو لڑکے بیٹھے تھے

ان کے کپڑے صاف تھے اور سر پر چھوٹی چھوٹی ململ کی ٹوپیاں، ان کے ساتھ
ان کی ماں بیٹھی تھی، ادھیڑ عمر کی لالائن جس نے ایک میلے رنگ کی ریشمی
دھوتی پہن رکھی تھی۔ اس کا گول چہرہ متین اور غمگین نظر آتا تھا۔ دونوں
لڑکے سمٹ کر الگ بیٹھے تھے، اور کبھی کبھی اُن دو ننھی ننھی لڑکیوں کی
ماں کو دیکھ لیتے، اُن کے چہروں پر غم و غصّہ اور خوف کے جذبات ہویدا
ہو جاتے، اور پھر وہ اپنا چہرہ پرے کر لیتے اور اپنی ماں کا آنچل پکڑ لیتے
ننھی لڑکیوں کی ماں کا چہرہ فق تھا۔ اور بار بار اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا
آتے، اور وہ انہیں کالے رنگ کے کھدر کے دوپٹے سے پونچھ لیتی اور
پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی، اس کا لڑکا اپنی ننھی بہنوں کو میٹھے نوسواد
اور کھٹے کچالو اور گنڈیریاں راستے کے مختلف اسٹیشنوں سے خرید کر کھلاتا تھا
اور لالائن کے لڑکے اُسے گھور کر دیکھتے اور پھر اپنی ماں سے کسی چیز کی
فرمائش کرتے اور پھر لالائن آہستہ سے جُھک کر سیٹ کے نیچے سے
ایک ٹوکری کا ڈھکنا الگ کر کے سیب یا سنگترے یا کیلے نکال کر اپنے
بیٹوں کو دیتی اور وہ اک فاتحانہ انداز سے ان دو لڑکیوں کے بھائی کی
طرف دیکھتے اور مزے سے پھل کھانے میں اور اسے دکھا دکھا کر کھانے میں

مصروف ہو جاتے۔

ابھی رام گڑھ بہت دور تھا۔ اور میں کھڑا کھڑا تھک گیا تھا۔ اس لئے میں نے اپنے قریب کی بنچ پر بیٹھی ہوئی ننھی لڑکی سے التفات ظاہر کیا۔ اُسے ایک دو اسٹیشنوں سے کھانے کے لئے چیزیں بھی خرید کر پیش کیں۔ بڑی پیاری ننھی سی لڑکی تھی۔ وہ بہت جلد میری گود میں آ گئی اور میں آرام سے اس کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اس نے میری ناک سے کھیلتے ہوئے کہا۔ "تم کدھل جا رہے ہو!"

میں نے کہا۔ "میں رام گڑھ جا رہا ہوں۔"

ننھی نے اپنی ماں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اماں! یہ رام گڑھ جا رہا ہے۔"

ننھی کی ماں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ قریب بیٹھی ہوئی لالائن اور اس کے دونوں لڑکوں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اور پھر کسی نے مجھ میں دلچسپی لینا مناسب نہ سمجھا۔ صرف میری گود میں بیٹھی ہوئی لڑکی ہی مجھے حیرت کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ حیرت اور خوشی۔ میں اس کا ساتھی تھا۔ ہم دونوں رام گڑھ جا رہے تھے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہارے ابا کا کیا نام ہے؟"

"وہ بولی۔" فیروز!"

"میں نے پوچھا۔" تمہارے ابّا رام گڑھ میں ہیں؟"

وہ بولی:" ہاں۔ میرے ابّا ویل میں ہیں۔"

"ویل میں؟" میں نے پھر پوچھا۔ اس کی بات سمجھ میں نہ آتی تھی، اب دو چار اور لوگ بھی ہماری گفتگو میں دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔

"ہاں۔ رام گڑھ ویل میں؟ کل اُن کو پھانسی ہوگی!" لڑکی نے نہایت اطمینان سے گنڈیری چوستے ہوئے جواب دیا۔

"جیل؟ پھانسی؟"

یکایک جیسے سارے ڈبّے میں سناٹا چھاگیا میں نے لڑکی کی اماں کی طرف دیکھا۔ لیکن اس نے اپنا چہرہ اپنے کالے دوپٹے میں چھپالیا تھا، اور سسکیاں لے رہی تھی، اس ڈبے کی خاموشی میں وہی سسکیاں پھیلتی جا رہی تھیں۔ لالائن نے اپنے دونوں بچوں کو اپنی چھاتی سے چمٹالیا۔ سب لوگ خوفزدہ سے ہو گئے تھے، جیسے اس چلتی گاڑی میں کسی نے پھانسی کا تختہ اُن کے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ اور وہ اپنی گردن اُسی رسی میں دیکھ رہے تھے۔

"اماں۔ ابا کی پھانسی ہو گی نا!" لڑکی نے بڑے چاؤ سے اپنی اماں سے پوچھا۔

اماں نے فوراً اُسے میری گود سے چھین لیا۔ اور زور سے ایک طمانچہ رسید کیا اور پھر اُسے اپنے کالے دوپٹے میں چھپا لیا۔ لڑکی بہت دیر تک اس کالے دوپٹے میں روتی رہی، لالائن اور اس کے بیٹے اور پرے سرک گئے، فرش پر دو کسان بیٹھے تھے وہ بھی رام رام کرتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور دور ڈبے کے دوسرے کنارے پر جا کھڑے ہوئے، اس عورت اور اس کی دو لڑکیوں اور اس کے لڑکے کے ارد گرد گاڑی کے مسافروں نے ایک نظر نہ آنے والی چار دیواری کھڑی کر دی اور پھر آہستہ آہستہ اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ صرف اُس چار دیواری کے اندر فیروز اور اس کی بیوی اور اُس کے بچے اکیلے رہ گئے تھے۔ اور ایک اجنبی ایک طرف دروازے کی دہلیز پر کھڑا تھا اور گاڑی چل رہی تھی۔

اس رات رام گڑھ سے دس میل باہر میرے دوست نے ایک دعوت کا انتظام کیا تھا۔ چاندنی رات تھی۔ لیکن چاند آدھے سے بھی کم تھا۔ اس لئے چاندنی میں سیاہی اور سیاہی میں چاندنی گھلی ہوئی تھی، ایسی رات عجیب پُراسرار ہوتی ہے، زندگی کسی نامعلوم راستے پر دوڑنا چاہتی ہے، اور اپنے عزیز ترین

Syeda

دوستوں کے چہرے بھی اجنبی معلوم ہوتے ہیں، اس محفلِ رقص وسرود میں مجمع بھی عجیب تھا۔ عورتیں بھی اس دیس کی معلوم نہ ہوتی تھیں، یہ ہنسی بھی فطری نہ تھی، نجانے غم کا ہلکا سا غبار مجھے فضا میں پیرتا ہوا کیوں معلوم ہوتا تھا

میرے دوست نے پوچھا "تم چپ کیوں ہو؟"

"تھکا ہوا ہوں شاید؟"

"اس لڑکی کا رقص تمہیں پسند نہیں"

"مجھے نیند آرہی ہے"

میرا خیال ہے، میں وہیں اُسی گاؤ تکیئے سے سہارا لگائے سو گیا۔ سوتے وقت صرف اتنا یاد ہے کہ زبان پر شراب کا ہلکا میٹھا ہلکا تلخ ذائقہ باقی تھا۔ لڑکی ناچ رہی تھی۔ گھنگھروؤں کی صدائیں اس کی جوان آواز پگھل پگھل کر کہہ رہی تھی:۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

میرے دوست نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا۔ موٹر بھاگتی جا رہی تھی۔ غالباً محفلِ رقص وسرود ختم ہو چکی تھی، اور ہم واپس رام گڑھ جا رہے تھے۔ فضا میں ایک اُجلا پن آ رہا تھا۔ اور بہت سے تاروں کے رنگ ماند پڑ گئے

تھے، لیکن دو ایک تاروں کے رنگ نکھر رہے تھے، یکایک ایک تارہ بہت
ہی روشن اور حسین نظر آنے لگا۔ دور کہیں مرغ بولا۔ اور پھر گھڑیال نے
پانچ بجائے۔

میرے دوست نے کہا۔ "مجھے کیا معلوم تھا تم اتنے تھکے ماندے
رام گڑھ پہنچو گے، میں نے تو یہ دعوت تمہاری خاطر منعقد کی تھی اور تم
— سوتے رہے!"

میں نے جمائی لے کر کہا۔ "بھئی معاف کرنا، میرے پاس پیسے بالکل
نہیں تھے کمبخت کبھی نہیں ہوئے۔ تھرڈ میں آیا۔ اب تم ہی بتاؤ....
"تھرڈ میں؟ لاحول ولا۔ بھئی ریس اندھا دھند نہ کھیلا کرو۔
"کون چغد ریس کھیلتا ہے، وہ تو یوں سمجھو کہ —— اچھا تو یہ بتاؤ کہ
اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"جیل خانے میں!"

"جیل خانے میں؟"

"ہاں۔ تمہیں ایک عجیب تماشہ دکھلائیں گے۔ کبھی پھانسی دیکھی ہے
تم نے؟"

ٹن!

گھڑیال کی آخری گونج میرے خون کی مدھم روانی میں مل گئی۔ اور پھر اس نے میرے خون کے ذرّے ذرّے کو چونکا دیا۔ ٹن ٹنن ٹن، میرے خون کا ہر ذرّا اس صدا سے گونجنے لگا، اور روانی بڑھتی گئی، اور مجھے اپنا گلا گھٹتا ہوا معلوم ہوا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن خون خود بول رہا تھا۔ اس نے مجھے بولنے نہ دیا۔ میں آہستہ آہستہ اپنا حلقوم سہلانے لگا۔

"شوفر تمہیں معلوم ہے۔ پھانسی کس وقت دی جائے گی۔"

"ساڑھے پانچ بجے حضور۔"

"گاڑی تیز چلاؤ۔"

ساڑھے پانچ میں چند منٹ باقی تھے۔ جب ہم جیل خانے کے پھاٹک کے اندر داخل ہوئے اور کار کو گھما کر اس طرف لے گئے، جہاں پھانسی کھڑی تھی، یہاں جیل کے ملازمین اور ڈاکٹر، اور چند افسر لوگ جمع تھے، ایک چھوٹے سے میدان میں پھانسی کھڑی تھی۔ دو لمبے لمبے سیاہ کھمبے ایک اندھے کنوئیں کے دونوں طرف کھڑے تھے، اور اس اندھے کنوئیں کے اُوپر لکڑی کا ایک تختہ بچھا تھا، اس پر بھی سیاہ رنگ

کیا ہوا تھا، اور دونوں کھمبوں کے درمیان جو دو لوہے کے تار تھے ان کا رنگ
بھی سیاہ تھا اور ان دونوں میں ڈیڑھ دو فٹ کا فاصلہ تھا۔ یہ دونوں تار ایک
دوسرے کے متوازی دونوں کھمبوں کے بیچوں بیچ چلے جاتے تھے، میدان
کے چاروں طرف اونچی دیواریں تھیں۔ جن کے اوپر کانچ کے تیز ٹکڑے
لگے تھے۔ اور ان سے پرے شمال مشرق میں پہاڑوں کی چوٹیاں دھندلی
دھندلی نظر آتی تھیں۔ آسمان اب ابر آلود ہو گیا تھا۔

ہم بھی ڈاکٹر کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے، وزیر صاحب کے لڑکے
کو دیکھ کر دو ایک افسروں نے ہمیں سلام کیا، چہرے دھندلے دھندلے
نظر آتے تھے، قریب کی دیوار کا سایہ ایک سیاہ لبادے کی طرح تماشائیوں
کے چہروں پر پھیلا ہوا تھا سب خاموش تھے۔ چند لوگ سگرٹ پی رہے
تھے، سگرٹ کا دھواں اور گرم گرم سانس کا دھواں فضا میں بل کھاتا ہوا
نظر آتا تھا۔

میں نے آسمان پر روشن ستارے کو ڈھونڈا، جیسے بچہ خواب میں
ڈر جانے پر اپنی ماں کی چھاتی ڈھونڈتا ہے، لیکن مطلع ابر آلود ہو چکا تھا۔ اور
اب تو ہلکی ہلکی بارش بھی شروع ہو گئی، کالی کالی دو چار چھتریاں کھل گئیں،

لیکن بارش بالکل معمولی سی تھی، جیسے ہلکی ہلکی اوس گر رہی ہو۔ ستارہ کہیں نظر نہ آیا۔

میں نے ناامید ہو کر اپنے دوست سے کہا۔ "چلو چلیں۔"

وہ بولا۔ "بڑے بزدل ہو۔ یہ منظر تمہیں زندگی بھر اور کہیں دیکھنا نصیب نہ ہو گا۔"

کہیں لوہے کا ایک پھاٹک کھلا، پھر سفید اُجلے کپڑے پہنے ہوئے ایک درمیانے قد کا آدمی پھانسی کی طرف چلتا ہُوا نظر آیا۔ اس کا سر منڈا ہُوا تھا۔ اور چہرے پر چھدری سی داڑھی تھی۔ وہ بالکل ہمارے قریب سے گزرا۔ اس کا چہرہ سپید اور مُتا ہوا تھا۔ اور اس کے ہات پیچھے پیٹھ پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے قریب ایک لمحے کے لئے رُکا۔ اور اپنے پہرہ داروں سے مخاطب ہو کر پھانسی کے کالے کھمبوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"وہ آگئی۔ میری جان لینے والی۔"

اس کی مسکراہٹ میں کیسی مردنی تھی، اس کی آواز میں کیسی تھرتھراہٹ تھی، جیسے اُس زندہ جلد میں ہوتی ہے، جسے چھری کی تیز دھار ذبح کرنے

کے وقت چھوئے، اس کی چال میں کیسی اکھڑی اکھڑی سی جھجک تھی، جیسے
وہ اپنی ٹانگوں سے نہیں لکڑی کی ٹانگوں سے چلتا ہو۔ پھر بھی وہ بہادر
آدمی تھا، دلیر آدمی تھا۔ اور بغیر کسی سہارے کے پھانسی کے تختے پر چڑھ
گیا اور خدا کا نام لینے لگا، بلند، صاف تیقن آمیز آواز میں ......!

وہ کس طاقت کو بلا رہا تھا۔

میں نے اپنے دوست سے پوچھا۔ "جلاد کہاں ہے ؟"

جیسے میرے سوال کا جواب دینے کے لئے ایک آدمی ایک لمبا
سفید کوٹ اور پتلون اور سیاہ بُوٹ پہنے ہوئے آگے بڑھا۔ اور پھانسی
کی طرف چلتا گیا، اُس کے سر پر سفید پگڑی تھی، اس کا قد چھ فٹ سے
کچھ نکلتا ہوا ہی تھا۔ وہ سیدھا دائیں ہات کے کھمبے کے قریب کھڑا ہو گیا،
اور اُس نے اپنا ہات لوہے کی پھرکی پہ رکھ دیا جس پہ ریشمی ڈوری بندھی
تھی، اس کے دوسرے ہات میں ایک سفید کپڑے کا غلاف تھا۔

میرے دوست نے کہا۔ "پرانے زمانے گئے۔ آجکل تو جلاد بھی
بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں کسی قاتل کا خون معاف کر دیا
جاتا تھا۔ اور وہ اس کے عوض میں سرکاری جلاد بنا دیا جاتا تھا حقیقت

یہ ہے کہ اس قاتل کو اسی لئے معاف کیا جاتا تھا۔ اسی شرط پر کہ وہ سرکاری جلّاد بن جائے۔

"اور اب؟" میں نے پوچھا۔

"اب معاملہ دوسرا ہے، اب تو قانون اس امر کی اجازت نہیں دیتا۔ کہ محض جلّاد بنانے کے لئے کسی کا خون معاف کر دیا جائے، اور عام طور پر لوگ جلّاد کے پیشے کو...... میرا مطلب ہے، اچھا نہیں سمجھتے۔"

"وہ کیوں؟ ہم قتل کرنا پسند کرتے ہیں۔ اور پھر اگر کوئی قتل کرے اُسے پھانسی کی سزا بھی دیتے ہیں۔ پھر جلّاد کے پیشے میں کیا برائی دیکھتے ہیں۔ کیا کہیں انسانی ضمیر کے اندر کوئی پھانس رہ جاتی ہے۔"

"جلّاد کے پیشے کے لئے ہمیں امیدوار نہیں ملتے، درانحالیکہ ریاست میں اس کے لئے تنخواہ بھی اور گریڈ بھی، اور ترقی کا انتظام بھی خاطر خواہ موجود ہے، پھر بھی.... جلّاد بننے کے لئے کوئی راضی نہیں ہوتا۔ اور اب تو جلّاد کا کام بھی اس قدر آسان ہو گیا ہے۔ بس چند لمحوں کی بات ہے۔۔

میرا دوست کہہ رہا تھا۔ اب فیروز کی پھانسی کے لئے بھی کوئی جلّاد نہیں ملتا تھا، بہتیری کوشش کی۔ آخر یہ آدمی راضی ہوا۔ یہ اسی جیل میں

کمپونڈر ہے، وہ ایک مرتبہ خود بھی رشوت ستانی کے جرم میں قید ہو چکا ہے
مریضوں کو پیٹنے میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔ اور زخموں کی چیر پھاڑ میں
تو اس کا مقابلہ اور کوئی کمپونڈر نہیں کر سکتا۔

یکایک فیروز نے پوچھا۔ "میرے تار کا کوئی جواب آیا؟"

ڈاکٹر نے سر ہلا کر کہا۔ "مجھے افسوس ہے، فیروز، تمہارے تار کا کوئی جواب
نہیں آیا"

رحم کی آخری درخواست بھی ٹھکرا دی گئی تھی۔

"تم اپنے بیوی بچوں سے مل سکتے ہو"

یکایک لوہے کا دروازہ پھر کھلا۔ اور دو عورتیں اندر داخل ہوئیں۔
دونوں کے ساتھ بچے تھے، دو ننھی لڑکیاں اور ایک لڑکا اور ایک کالا دوپٹہ
اوڑھے ہوئی عورت، دوسری عورت کے ساتھ دو لڑکے تھے جنہوں نے
چھوٹی چھوٹی سفید ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ دو پیلی ٹوپیاں،

دائیں کھمبے پر کالے دوپٹے والی عورت کھڑی ہو گئی، بائیں کھمبے پر
وہ لالائن اور اس کے لڑکے۔

"یہ کیا تماشہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

میرے دوست نے جواب دیا " وہ لالائن مقتول مہاجن کی بیوی ہے، وہ اس کے دونوں لڑکے ہیں۔"

فیروز نے ہنس کر کہا " چھوٹے شاہ جی، اپنے باپ کے قاتل کی پھانسی دیکھنے آئے ہو۔"

میں نے کہا " یہ انتہائی ظلم ہے، ان لوگوں کو یہاں نہ آنے دینا چاہیئے۔"

میرا دوست بولا " پہلے تو اس ریاست میں کیا ساری دنیا میں سربازار پھانسی دی جاتی تھی۔ تاکہ سب کو عبرت حاصل ہو۔"

" چھوٹے شاہ جی کا اب کلیجہ ٹھنڈا ہو گا۔" فیروز نے تلوار کی دھار کی طرح تیز لہجے میں کہا۔

دائیں طرف اس کی بیوی اپنے بچوں کو لئے کھڑی تھی۔ لیکن فیروز نے ان کی طرف نہ دیکھا۔ بس وہ عورت اس کی طرف تکتی گئی، اور فیروز، لالائن اور اس کے بچوں کی طرف دیکھتا رہا۔

یکایک ننھی لڑکی نے ہات پھیلائے اور کہا " ابا۔"

ابا!!

ابا!!!

فیروز نے ایک لمحے کے لئے شمال مشرق کی طرف مڑ کر دیکھا۔ لیکن روشن ستارہ کہیں نہ تھا۔ چاروں طرف بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔

میں نے اپنے دوست سے کہا۔ "یہ انتہائی ظلم ہے۔ ان بچوں کو یہاں آنے کی اجازت نہ ہونی چاہیئے۔"

لڑکی نے کہا۔ "ابّا۔۔۔۔ ابّا۔۔۔۔ ابّا !!!"

فیروز نے آہستہ سے جلّاد سے کہا۔ "مجھے جلدی سے غلاف اڑھا دو میں اپنی بچیوں کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔"

میرے دوست نے جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے کچھ کہا۔ اس نے حکم دیا کہ اب دونوں عورتوں اور ان کے بچوں کو وہاں سے پرے ہٹا دیا جائے۔

لوہے کا پھاٹک ایک بار پھر کھلا۔ اور لالائن اور اس کے دونوں بیٹے باہر چلے گئے۔ فیروز کی بیوی ایک بار رکی، مڑی اور چیخ مار کر اپنے خاوند کی طرف بڑھنا چاہتی تھی، کہ پہرہ داروں نے اُس کے منہ پر ہات رکھ دیا اور اُسے لوہے کے پھاٹک کے باہر دھکیل کر دور کہیں جیل خانے

کے دوسری طرف لے گئے۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ ابھی ساڑھے پانچ بجنے میں چار منٹ باقی تھے۔

"تم کچھ کہنا چاہتے ہو فیروز!" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"دعا کرو۔ میرے لئے دعا کرو۔ سب لوگ میرے لئے دعا کرو" فیروز کی آواز اس غلاف کے اندر سے اس طرح آ رہی تھی، جیسے وہ کسی تاریک اندھے کنوئیں میں بول رہا ہو!

جلاد نے ریشمی ڈوری کا پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا۔ اور پھندے کی گانٹھ کو اس کے گلے میں فٹ کر دیا! انصاف کی رسّی!

فیروز زور زور سے اور تیزی سے اپنے خدا کو یاد کرنے لگا۔

وہ کس طاقت کو بلا رہا تھا!

ایک منٹ گزر گیا۔

دوسرا منٹ گزر گیا۔

تیسرا منٹ گزر گیا۔

چوتھا منٹ گزرا ـــــ ٹن! جیل خانے کے گھڑیال نے بجایا۔ گونج فضا میں تھرانے لگی۔

ڈاکٹر نے سفید رومال ہلایا اور دائیں کھمبے کی بھرکی ہلی، اور پھانسی کا تختہ بیچ میں سے شق ہو گیا، اور عین اُسی لمحے فیروز ہماری آنکھوں کے سامنے سے گم ہو گیا، وہ اب ان دونوں تختوں کے نیچے اندھیرے کنوئیں میں اُسی ریشمی ڈوری سے لٹکا ہوا دم توڑ رہا تھا۔

صرف چند سیکنڈ کے لئے لاش تڑپی، جس طرح بجلی کا تار جسم سے چھو جائے۔ ایک سیمابی اضطراری حرکت، کرب اور بے چینی، اور مہیب اضطراب، جیسے لاکھوں ٹن پانی کا طوفان یکایک جہاز سے ٹکرا جائے جیسے ریلتا ہوا لاوا یکایک کسی آتش فشاں چوٹی سے پھٹ پڑے اور فضا میں آگ ہی آگ برسا دے، جیسے خون کی ہر بوند میں اور دماغ کی ہر نس میں بارود کا فلیتہ یکایک بھک سے اڑ جائے، نہیں، جب بھی نہیں، اس تڑپ، اس اضطراب، اس کرب کا جواب دنیا میں کہیں نہیں ہے، جب روح اور جسم اس طرح زبردستی ایک دوسرے سے جدا کئے جاتے ہیں

وہ اضطراب، وہ حرکت، وہ تڑپ، بجلی کی ٹیڑھی لکیر کی طرح میری روح کو چیرتی ہوتی نکل گئی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے آپ کو مرتے دیکھا۔ اپنے ایمان کو خاکستر ہوتے دیکھا، اپنے تہذیب و تمدن کو

خس وخاشاک کی طرح جلتے ہوئے دیکھا، وہ انسان، وہ اس کا خدا، وہ اس کی تہذیب جس نے اس پھانسی کو روا رکھا ہے جس نے خون کا بدلہ خون میں لینا چاہا ہے کبھی پنپ نہیں سکتے، کبھی اُٹھ نہیں سکتے، کبھی بلند نہیں ہوسکتے۔ فیروز کی صورت یاد نہیں۔ ہاں یاد کے ہر کونے میں پھانسی کا ایک تختہ دیکھتا ہوں، جس پر ایک سفید کپڑوں میں ملبوس صورت دیکھتا ہوں اس کا چہرہ غلاف کے اندر ہے اور اس کے بازو پیچھے بندھے ہوئے ہیں۔

یہ صورت، جب بھی اکیلا ہوتا ہوں، میرے سامنے آتی ہے، اور ایک خاموش طعنہ بن کر مجھ سے پوچھتی ہے، مجھے جانتے ہو، میں انسان ہوں۔ نیکی اور بدی کا پتلا، ازلی، ابدی انسان، تم نے مجھے اک ریشمی ڈوری سے اندھے کنوئیں میں لٹکا رکھا ہے، کیا مجھے کبھی رہائی نصیب نہ ہوگی۔

بھوت

بارش ہو رہی تھی۔ گزشتہ پانچ روز سے متواتر موسلا دھار پانی برس رہا تھا بادلوں کا رنگ دھواں دھواں تھا، اور زمین مخمل، پانی میں بھیگی ہوئی سبز مخمل جس پر پاؤں پھسلتے تھے اور پانی کے بلبلے بنتے اور پھٹتے تھے۔ فضا میں گرتی ہوئی بوندوں کا اندوہناک شور تھا اور سڑی ہوئی مٹی کی باس مینڈک پانی کی وقتی جھیلوں میں ٹراتے تھے۔ ایک بہت بڑا بھورے رنگ کا مینڈک ان کے سامنے سے پھدکتا اور ریل کی پٹری کو پار کرتا ہوا آگے نکل گیا۔ سگنل والے کی کوٹھری کے پاس ایک بھینس چر رہی تھی، مینڈک اس کے پاؤں تلے آگیا۔ حادثہ، اتفاق، خدا کسی کو کیا کہیے۔ زندگی موت

میں مبتدل ہو چکی تھی۔

گاڑی آنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ اس نے ٹکٹ خریدا، چھاتا کھولا۔ چنے والے سے چنے کھائے، اخبار پڑھا۔ بوٹ پہ پالش کرایا۔ سر کھجایا۔ اٹھ کر ٹہلا۔ ٹہل کر بیٹھ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا مضافاتی اسٹیشن تھا۔ بمبئی سے انیس میل دور، اور یہ اُنیس میل۔ اس وقت ہزاروں میل معلوم ہو رہے تھے۔ پلیٹ فارم کی گھڑی کی سوئیاں گویا مدت سے ساکن تھیں۔ شاید یہ کمبخت بھی گاڑی کی آمد کا انتظار کر رہی ہیں۔ اُس نے جمائی لی۔ اِدھر اُدھر دیکھا، کہیں کوئی خوبصورت عورت بھی تو نہ تھی۔ نگاہ کہیں نہیں رُکتی۔ لوہے کے زنگ آلود تاروں پر کوّے ٹھٹھر رہے تھے۔ نم آلود بنچوں پہ کائنات کی بدصورت ترین مخلوق بیٹھی ہوئی پان کی جگالی کر رہی تھی، مونگ پھلی کھا رہی تھی۔ رانیں سہلا رہی تھی۔ چنے کی خشک دال میں؟ کاندہ نمک اور سرخ مرچ اور نیمبو کا رس ڈال کر اپنے دانتوں کی چکی تلے پیس رہی تھی اور بار بار آنکھیں جھپک کر ریل کی چمکتی ہوئی لائن دیکھنے میں مصروف تھی۔ ..... گاڑی ..... کہیں کوئی گاڑی نہ تھی۔ ریل کی چمکتی ہوئی پٹڑی دور فضاؤں میں گم ہو رہی تھی۔ اور پانی برس رہا تھا۔ اور مینڈک ٹرا رہے تھے۔

اگر وہ پانچ منٹ پہلے آجاتا تو بوری ولی سے آنے والی گاڑی پر سوار ہو سکتا تھا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اب چھ بج چکے تھے۔ اور اُسے دوسری گاڑی کا انتظار تھا جو پونے سات بجے آئے گی۔ اُس نے چھاتا اُٹھا کر اسٹیشن کے ایک کھمبے سے لگا دیا۔ اور قریب ہی ایک بنچ پر بیٹھ گیا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا "فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کی عورتوں کے لیے۔" اوّل تو اُسے پلیٹ فارم پر پہلے اور دوسرے درجہ کی ایک عورت بھی نظر نہ آئی تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ مردوں کے بنچوں پر عورتیں اور عورتوں کے بنچ پر مرد بیٹھے تھے۔ اس نے سوچا اس مرد میں بھی کس قدر ذم کا پہلو نمایاں ہے۔ لیکن کمبخت اسٹیشن ماسٹر کو اپنی پتلون کی نوک پلک درست کرنے ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ وہ پلیٹ فارم کا اخلاق کیسے سمجھ سکتا ہے۔ چھاتے کی دراز کمانیوں سے پانی ٹپ ٹپ کر کے بہ رہا تھا۔ اور فرش پر بہتا ہوا کچھ لکھتا جا رہا تھا۔ یا گری کے حروف، اُردو کے حروف۔ گیدڑ کا منہ۔ شیر کے ایال۔ جناح کا چہرہ۔ گاندھی کا جبڑہ۔ چرچل کا سگار۔ مندر کی تکونی چھت جو دیکھتے دیکھتے مسجد کے گنبد میں تبدیل ہوئی اور پھر گاتھک گرجا کی صورت میں نمودار ہو گئی۔ اور پھر اک عالی شان محل کا کھنڈر بن گئی۔ قطرہ قطرہ کر کے پانی بہہ رہا تھا۔ اور ایک

ہی قلم کی نوک سے مختلف زبانیں، تہذیبیں، شخصیتیں اور مذاہب ایجاد کرتا چلا جا رہا تھا۔ اب چھاتنے کی مڑی ہوئی مٹھی کے نیچے بہت سا پانی جمع ہو کر ایک چھوٹی سی جھیل بن گیا۔ وہ منبع تھا تو یہ منزل ہے۔ اس نے سوچا جہاں سب تہذیبیں اور کلچر اور شخصیتیں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ پانی بھی خوب چیز ہے صاحب! ہندو پانی، مسلم پانی اور پھر —— چھاتنے کا پانی! —— گاڑی ابھی نہیں آئی تھی۔

ملاڈ سے چرچ گیٹ تک جانے میں پورا ایک گھنٹہ صرف ہوگا اس خیال سے اس کی کنپٹیاں دُکھنے لگیں۔ اور اسے اسپرو کے پیکیٹ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن ملاڈ تو ایک ذلیل مضافاتی اسٹیشن تھا، یہاں اسپرو تو کیا جنجر کی بوتل بھی مہیا نہ ہو سکتی تھی۔ جنجر کی بوتل سے اس کے سر کا درد کیسے دور ہوتا۔ لیکن وہ جنجر کی بوتل ضرور پینا چاہتا تھا۔ دراصل وہ ملاڈ اسٹیشن سے فوراً رخصت ہو جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس کی فضا میں برستی ہوئی بارش کی اُداسی تھی۔ اور مینڈک ٹرا رہے تھے۔ اور غلیظ کوّے زنگ آلود تاروں پر بیٹھے ہوئے اپنے ناپاک جسموں کو اپنی کالی کالی چونچوں سے صاف کر رہے تھے۔ اور گندے امیر و کبیر مارواڑی دھوتیوں سے جوئیں چننے میں مصروف

تھے۔ اور مٹیالی مٹیالی عورتوں نے ایک ہی قسم کے پھول ایک ہی طرح پر اپنے جوڑوں میں اگا رکھے تھے۔ اور سیدھی مانگ نکال کر اپنے بالوں میں کھوپرے کا تیل لگا کر انہیں پالش کئے ہوئے بوٹ کی طرح چمکایا ہوا تھا۔ اور وہ سیدھی مانگ دور سے بالکل ریل کی پٹڑی معلوم ہو رہی تھی۔ اور گاڑی ابھی تک نہ آئی تھی۔ عورت اور ریل کی پٹڑی میں کیا فرق ہے۔ اس نے سوچا۔ ریل کی پٹڑی کئی اسٹیشنوں پر ٹھہرتی ہے۔ عورت صرف ایک سٹیشن پر۔ اور اگر ایک سے زیادہ اسٹیشن پر ٹھہرے تو عورت نہیں طوائف کہلاتی ہے۔ انتظار دونوں کے لئے کرنا پڑتا ہے۔ اور جو مزا انتظار میں ہے وہ گاڑی پر چڑھنے میں نہیں۔ عورت تک پہنچنے کے لئے اس سے شادی کرنا پڑتی ہے اور گاڑی کے لئے ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے۔ اور جو لوگ بے ٹکٹ سفر کرتے ہیں۔ وہ سماجی اعتبار سے بد اخلاق سمجھے جاتے ہیں۔ گاڑی ہو یا عورت۔ بے ٹکٹ سفر کرنے والے کو ہر حالت میں سزا ملتی ہے توبہ۔ توبہ کیسی بُری بُری باتیں سوچ رہا تھا وہ اس کے کنوارے جذبات خطرناک حد تک بد اخلاقی کے مرتکب ہو رہے تھے۔ اب اُسے ازدواجی زندگی کا ٹکٹ خریدنا ہی پڑے گا۔

اب گاڑی آبھی چکے۔ اُس نے پلیٹ فارم کی گھڑی کی طرف دیکھا۔
ابھی صرف دس منٹ گزرے تھے۔ صرف دس منٹ؟ اور وہ اپنی
دانست میں کئی عمریں گزار چکا تھا۔ وہ بچپن سے جوانی اور جوانی سے
بڑھاپے میں آیا۔ پھر اپنے بچپن کے سہانے خوابوں کی سمت لوٹ چلا
تھا۔ لیکن گاڑی پھر بھی نہ آئی تھی۔ اور ابھی صرف دس منٹ گزرے تھے
اُس نے پالش والے لڑکے کو آواز دی۔ ابے او لڑکے پالش والے!
پالش والا لونڈا ایک نتھنے میں انگلی ڈال کر گنگنے الفاظ میں بولا۔
"صاحب، ابھی تو ترا بوٹ پالش کیا ہے۔"
"کوئی حرج نہیں۔ اسے پھر پالش سے اچھی طرح چمکا دے۔ دیکھ
کے اچھی طرح سے پالش کیجو دو آنے دونگا۔"
پالش والے نے اس کے پاؤں اپنی پھٹی ہوئی نیکر پر رکھ لیئے نیکر جو
کبھی خاکی رنگ کی تھی لیکن اب جگہ جگہ سے پھٹ کر بے رنگ ہو چکی تھی۔
پالش والے کی ٹانگوں پر چھوٹے چھوٹے بیشمار زخم اور پھنسیاں تھیں۔ اس
کے ننگے پاؤں میں بیائیاں پھوٹ آئی تھیں۔ اور اُس کی ناک سے نزلہ
ٹُرٹُر کر کے بہتا تھا۔ لیکن پالش والا لونڈا بھی بڑا ہوشیار تھا۔ وہ اپنے

بہتے ہوئے نزلے کو ایک ہی بار سانس کھینچ کر فوراً ناک کے اندر لے جاتا تھا
تھوڑی دیر کے بعد نزلہ پھر اس کے نتھنوں سے بہنا شروع ہو جاتا۔ وہ
سوچتا کہ اب گرا۔ یہ نزلہ میرے بوٹ پر اب گرا۔ لیکن پالش والا لونڈا بڑا
ہوشیار تھا۔ اُس نے پھر زور سے سانس لیکر نزلہ کے لعاب کو ناک کے
اندر کھینچ لیا اور برش کو زور زور سے بوٹ پر رگڑنے لگا۔ گاڑی پھر بھی
نہ آئی۔ شاید یہ گاڑی کبھی نہیں آئے گی۔ اس نے پالش والے سے کہا۔
بوٹ کے تسمے کھول دو۔ اور بوٹ الگ لے جا کر پالش کرو۔ اس نے
سوچا۔ چلو تسمے کھولنے ہی میں کچھ وقت صرف ہو گا۔

گاڑی ابھی تک کیوں نہیں آئی۔ پلیٹ فارم کی گھڑی اس قدر
سست کیوں ہے۔ بارش اس طرح کیوں برس رہی ہے۔ کیا یہ اب
کبھی نہیں رُکے گی! ریلوے والوں نے فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے
بنچوں کے سامنے کھپریل لگا دیئے تھے۔ پردے کے لئے نہیں، بارش کی
بوچھاڑ سے بچنے کے لئے وہ ریلوے کا تہ دل سے شکر گذار تھا۔ لیکن اُسے
اس وقت کھپریل کی نہیں، ایک گاڑی کی سخت ضرورت تھی۔ جو اُسے
چند لمحوں میں ملاڈ سے چرچ گیٹ پہنچا دے۔ جہاں اس کی محبوبہ اس
کا انتظار کر رہی تھی۔

چرچ گیٹ پر اس کی محبوبہ اس کی راہ تک رہی ہے۔ اور وہ ملاڈ میں لکڑی کے ایک گلے سڑے بوسیدہ بنچ پر بیٹھا اپنے جوتوں پر پالش کرا رہا ہے۔ اور پالش والے لونڈے کی ناک سے بہتا ہوا نزلہ دیکھ دیکھ کر خودکشی پر آمادہ ہو رہا ہے۔ گاڑی نہیں آئی۔ ضرور کوئی حادثہ ہو گیا ہے کوئی کھمبا گرا ہو گا۔ "آزادی پسندوں" نے پٹڑی توڑ دی ہو گی۔ ریل اُلٹ گئی ہو گی، یہ گھڑی غلط ہو گی۔ بجلی کے تار فیل ہو گئے ہونگے۔ سگنل نہ ملا ہو گا۔ راستے میں پُل طوفان سے اڑ گیا ہو گا۔ سمندر کا پانی ٹھاٹھیں مارتا ہوا گاڑی کے سر سے گزر گیا ہو گا۔ ورنہ گاڑی ابھی تک آ گئی ہوتی!

آج فتح کی خوشی میں وہ چرچ گیٹ جا رہا تھا۔ جہاں نیلا ریشمی سایہ پہنے اس کی محبوبہ اس کی راہ تک رہی ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ آج اُس نے وہی نیلا ریشمی سایہ پہنا ہو گا جو اسے بہت پسند ہے۔ اور جس کے دام ابھی اُس نے درزی کو ادا نہیں کیئے۔ کانوں میں الکٹرو پلیٹیڈ نکل کے آویزے ہونگے۔ بڑے بڑے ہلالی آویزے۔ عید کے چاند کی طرح خوبصورت اور اُن آویزوں کے بیچ میں موتی ٹکے ہونگے۔ موتی، آبدار موتی، دمکدار موتی، چمکدار موتی، طرح دار موتی . . . . ایں۔ اُس نے اپنے

اُلجھے ہوئے تصوریں آویزوں کو بازاری کتابوں کے ناموں سے کیوں گڈمڈ کر دیا تھا۔ اس کی محبوبہ تو بازاری نہ تھی، بے حد شریف لڑکی، نیلا سایہ اور سفید سینڈل پہننے والی لڑکی۔ گورے گورے چکنے رخساروں والی، ہنس ہنس کر اُلّو بنانے والی لڑکی اور پھر پیچھے مڑکر راہگیر کی تفریحی نگاہوں سے خراج وصول کرنے والی۔ بے حد شریف کنواری لڑکی، پڑھی لکھی خاندانی لڑکی، چرچ گیٹ پر اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ اور گاڑی ابھی آئی نہ تھی۔ اور آج فتح کا دن تھا۔ دوسری جنگِ عظیم ختم ہو گئی تھی۔ اور دنیا نے تھک کر امن و چین کا سانس لیا تھا، جرمنی —— اور پھر جاپان شکست خوردہ ہو کر ہتھیار ڈال چکے تھے اور اُس کی محبوبہ نے نیلا ریشمی سایہ پہنا تھا جس میں اُس کا چھریرا نازک متناسب جسم کنواری بہاروں کی طرح شگفتہ و شاداب نظر آتا تھا۔ دنیا میں بہار آ گئی تھی اور وہ ملاڈ میں جوتوں پہ پالش کرا رہا تھا۔

آج گاڑی نہیں آئے گی۔ آج وہ فتح کا جشن نہیں منا سکے گا۔ اُن کی مسرتوں میں شریک نہیں ہو سکے گا۔ فورٹ ایریا میں گھومتی ہوئی قمقموں سے جگمگاتی ہوئی ٹراموں کی روشنی نہ دیکھ سکے گا۔ ڈیموکراسی کے سپاہیوں

کو جام پر جام لنڈھاتے اور ابدی امن کے ترانے گاتے نہ سن سکے گا۔ ناچ گھر میں نیلے سایہ کے محور کے گرد طواف نہ کر سکے گا۔ جو ہو کے ساحل کی ریشمی ریت پر لٹا کر اُس کے ہونٹ نہ چُوم سکے گا۔ بس آج وہ جوتے پالش کرائے گا۔ اور ناک سے بہتے ہوئے نزلے کو اندر سے باہر اور باہر سے اندر جاتے ہوئے دیکھتا رہے گا۔ اور اس کی محبوبہ ناامید ہو کر واپس چلی جائے گی۔ اور قمقمے بجھ جائیں گے اور مسکراہٹ بجھ جائے گی۔ اور مسرت کے ترانے خاموش ہو جائیں گے اور بھیگی بھیگی گھاس پر مینڈک ٹرّاتے رہیں گے۔ اور لاپروا بھینسوں کے پاؤں تلے کچلے اور مسلے جائینگے بالکل اسی طرح جیسے اب اس کا دل مسلا اور کچلا جا رہا تھا۔ کیونکہ گاڑی نہیں آتی تھی —— فرطِ یاس سے مغلوب ہو کر اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو سب سے پہلے اُس کی نگاہ ایک ٹوکرے پر پڑی۔ جو اب اس کے قدموں کے قریب فرش پر پڑا ہوا تھا جو ابھی یہاں رکھا گیا تھا۔ اس ٹوکرے میں مچھلیاں تھیں۔ سمندری مچھلیاں موٹی پتلی۔ اُلٹی سیدھی، چھوٹی بڑی ہر قسم کی مچھلیاں —— اور اس ٹوکرے

کے پاس ایک نیم برہنہ انسان بیٹھا تھا جس نے تاڑی پی رکھی تھی۔ اور جو اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اُس کا سیاہ گٹھا ہوا جسم خوبصورت تھا۔ دانت مضبوط اور سپید دھڑ سے اوپر ننگا، پاؤں ننگے اور آدھی رانیں بھی ننگی۔ صرف کمر کے اُوپر کسی پُرانی دھوتی کا چیتھڑا تھا، گیلا، پتلا، بارش کے پانی سے شفاف ہو گیا تھا۔ کپڑا نہ تھا۔ ایک آئینہ تھا جس میں انسانیت کا چہرہ نظر آتا تھا۔ وہ ماہی گیر نہ تھا۔ اس کے خدوخال بھیلوں کے سے تھے آنکھوں میں جنگلی وحشت تھی۔ بازوؤں میں ایک رُکی ہوئی جابر توانائی، اعضا میں اک لچک، لوچ اور گھلاوٹ جیسے وہ کسی مہذب بستی کا انسان نہ تھا۔ جنگل کا خوبصورت جانور تھا۔ اور مچھلیاں پکڑ کر لایا تھا۔ اور تاڑی پی کر ہنس رہا تھا۔

قریب ہی اس کی بیوی بیٹھی تھی۔ وہ بھی نیم برہنہ تھی۔ اور ایک نحیف و نزار بچے کو اپنی گود میں لئے ہوئے تھی۔ اور اپنے تندرست تھنوں سے اُسے دودھ پلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ بلند آواز میں اپنی ناکامی کا ماتم بھی کرتی جا رہی تھی۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کی ناک بہہ رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں سے

ٹپک رہی تھی۔ اور وہ ایک بچے کی طرح تھی جس کا عزیز ترین کھلونا اس سے چھینا جا رہا ہو۔ وہ رو رہی تھی۔ اور اس کا نحیف و نزار بیمار بچہ قے پر قے کر رہا تھا۔ اور اس کا دم الٹ رہا تھا اور پلیٹ فارم کا فرش غلیظ ہو گیا تھا۔ اور بچے کی گردن ایک طرف جھک گئی تھی۔ اور وہ بھیل یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ہنس رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اور اس نے تاڑی پی رکھی تھی۔

بچے نے پھر قے کی، اور وہ لڑکی زور زور سے چلانے لگی۔ اور بھیل اُسے پیٹنے لگا۔ اور لڑکی نے ساگ کا گٹھا بھیل کے سر پر دے مارا۔ اور لوگ ہنسنے لگے۔ اور پھر وہ بھیل خود بھی ہنسنے لگا۔ عجیب سی ہنسی تھی۔ جیسے وہ آدمی نہیں تھا۔ پاگل تھا۔ ایسی بھی کیا ہنسی۔ مانا کہ آج جشنِ آزادی ہے جشنِ فتح ہے۔ آج دنیا کو فاشیت کے چنگل سے نجات ملی ہے۔ اور ہندوستان کا ہر ہوٹل مسرت کے نغمے گا رہا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ یوں بے سوچے سمجھے تاڑی پی کر ہنسا جائے۔

چھوٹے بچے کا سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ اور وہ نیم برہنہ بھیلنی بیٹھی ہوئی اپنی پھٹی ہوئی دھوتی سے اس کی قے صاف کر رہی تھی۔ اور

پولیس مین اسے اِس طرح غلاظت پھیلانے پر گالیاں دے رہا تھا۔ اور اس کے پستان ننگے تھے۔ اُس کی باہیں ننگی تھیں۔ اور کاٹن مارکیٹ میں کروڑوں من روئی کے انبار لگے تھے۔ اور اس کا پیٹ ننگا تھا۔ اور اس پر اک خوفناک ناگ کی تصویر کھدی ہوئی تھی۔ اور اس کی باہنوں پر بھی خوفناک دیوتاؤں کی سبز تصاویر کھُدی تھیں۔ سٹاک ایکسچینج میں سونے چاندی اور روئی کا بھاؤ گر رہا تھا۔ لیکن وہ نیم برہنہ تھی۔ اور اُس کی ننگی باہوں میں لکڑی کے موٹے کڑے تھے۔ سونے کے نہیں، چاندی کے نہیں، پیتل یا تانبے کے بھی نہیں صرف لکڑی کے۔ اور ٹخنوں پر پائل کی تصویر کھدی تھی۔ کیونکہ جب عورت کو زیور نہ ملے تو وہ اُس کی تصویر دیکھ کر ہی کیوں نہ خوش ہو......؟

اس کا لڑکا اس کی گود میں دم توڑ رہا تھا اور وہ رو رہی تھی۔ اور پولیس مین اسے گالیاں دے رہا تھا۔ اور اُس کا خاوند تاڑی کے نشے میں وحشت، اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ وہ ننگا تھا۔ اور اس کی بیوی ننگی تھی اور اُن کے آنسو ننگے تھے اور ان کی ہنسی ننگی تھی کیونکہ بھیل سے اس کا جنگل چھن گیا تھا۔ اُس کا دیس چھن گیا تھا۔ اُس کے تیر و کمان

چھن گئے تھے۔ اب وہ اپنے گھر میں بے گھر تھا، بے ہتھیار تھا، بے علم تھا۔
جنگل چھنا۔ لیکن شہر نہ ملا۔ جنگل کی چھال چھنی لیکن روئی کا سوت نہ ملا۔ شکار
چھنا۔ لیکن روٹی نہ ملی۔ تیر و کمان چھنے۔ لیکن بندوق نہ ملی۔ جڑی بوٹی چھینی
لیکن دوا نہ ملی۔ وہ نہتا تھا۔ بے یار و مددگار تھا۔ اور ہتھیلیوں کا ٹوکرا لیے
پلیٹ فارم پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ کیا کرے۔ اس
نئی دنیا میں جہاں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔

اس کا جھولتا ہوا سر اور بھی جھولنے لگا۔ اور ریل کے کھمبے کا سہارا
لے کر اپنے پیٹ پر جھک گیا۔ یکایک اس کی بیوی نے ایک چیخ کے ساتھ
اپنے سر کو دوہتڑ سے پیٹ ڈالا۔ کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ وہ بار بار قے کرنے والا
غلیظ لڑکا اس دنیا سے چل بسا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ اور وہ
بے وقوف عورت بار بار اپنے جوان پستان اس کے مردہ ہونٹوں
میں ٹھونسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس لئے کہ اس کی ماتا کے پاس اپنے
دودھ بھرے پستانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ دوا کیا ہے۔ کھانا کسے کہتے ہیں
مکھن اور دودھ، گلوکوس اور وٹامن اور کالرے کو روکنے والے انجکشن
اور ڈاکٹر لوگ یہ سب کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا

ریشم کیا ہے۔ سینڈل کیا ہے۔ پتلا سایہ کیا ہے۔ آرام کیا ہے۔ کتاب کیا ہے
علم کیا ہے۔ تہذیب کیا ہے۔ ہونٹ کیسے مسکراتے ہیں۔ آنکھیں کیسے چمکتی
ہیں۔ سانس میں خوشبو کا تعطر کیسے پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا فتح
کسے کہتے ہیں۔ فاشزم اور ڈیموکریسی اور جنگ اور امن میں کیا تفریق ہے۔
اسے کچھ بھی تو معلوم نہ تھا۔ وہ یکایک اپنے مردہ بچے کو لے کر کھڑی ہو
گئی۔ چمکتے ہوئے بالوں والی عورتوں سے جوئیں چننے والے امیر و کبیر
مارواڑی سے سیٹی بجاتے اور اپنی پتلون کی نوک پلک سنوارتے ہوئے
اسٹیشن ماسٹر سے اس کی حیران پھٹی پھٹی نگاہیں کچھ کہہ رہی تھیں۔ اُس کے
چمکدار بوٹ کی نوک سے کچھ پوچھ رہی تھیں اور جب کہیں بھی انہیں اپنے
سوال کا جواب نہ ملا تو اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں اور ہراساں ہو کر زمین
پر بیٹھ گئی۔ جیسے اس نے اس ذلیل مضافاتی اسٹیشن پر آدمیوں کا نہیں
چٹانوں کا منہ دیکھا تھا۔

گاڑی اب دور سے نظر آ رہی تھی۔ اور اس کا جُوتا شفاف آئینے کی
طرح چمک رہا تھا اور اس نے صاف ستھرے چمکتے ہوئے جوتے کی
نوک سے جھولتے ہوئے بھیل کو اک ٹھوکا دیا۔ بھیل ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ گاڑی

آگئی۔ بھیل نے اپنے سر پر مُردہ مچھلیوں کا ٹوکرا رکھا، بغل میں مردہ بچے کو دبایا۔ ہاتھ سے سسکتی ہوئی بیوی کو پکڑا اور تھرڈ کے ایک ڈبے میں گھس کر بیٹھ گیا۔ اُس کی نگاہوں میں وہی وحشت تھی۔ لبوں پر وہی ہنسی۔

اور ـــــ وہ ـــــ فرسٹ کلاس کے نرم گدیلے پر بیٹھ کر بھی اک موہوم سا خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ اُس کے بزدل ذہن میں لاکھوں کروڑوں ننگے بھوکے پیاسے بیمار آدمی اُبھر رہے تھے۔ گھستے چلے آ رہے تھے۔ اُس کے ذہن کے نرم نرم گداز گدیلوں پر بیٹھتے جا رہے تھے۔ اور اُس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ یہ ہنسی کیا ہے۔ یہ میرے گلے میں پھندا سا کیوں ہے۔ یہ کس کے ہاتھ آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ پھیلے پھیلے، ٹیڑھے ٹیڑھے لمبے لمبے ہاتھ۔ سوکھے سکڑے، سہمے سہمے ہاتھ، کمزور ہاتھ، قوی ہاتھ۔ وحشی ہاتھ بزدل ہاتھ، دلیر ہاتھ، کالے ہاتھ، گورے ہاتھ، پیلے ہاتھ، کریمہ بدنما ہاتھ، ہاتھ ـــ جن پر زخموں کے نشان تھے۔ کوڑوں کے نشان تھے۔ ہل کی ہتھی کے نشان تھے۔ مشین چلانے کے نشان تھے۔ تیل کے نشان تھے۔ گولیوں کے نشان تھے ـــ ہاتھ ـــ جن پر انگلیاں نہ تھیں۔ شکستہ بوڑھے ہاتھ ـــ جن پر نیلی وریدیں اُبھری ہوئی تھیں۔ کانپتے ہوئے ٹھنٹھ، خوف سے لرزتے ہوئے لمبے لمبے ناخنوں والے ہاتھ جو ننگے تھے۔ اور خون آلود

تھے اور ناسوروں سے بھرے ہوئے تھے۔ اور اس پر ہنس رہے تھے۔
اُن کی خاموشی میں ایک مہیب گویائی تھی۔ اُن کے تاریک سایوں میں ایک
عجیب گونج تھی۔ کسی خوفناک طوفان کی گونج ......اور یہ ہاتھ بڑھتے چلے
آرہے تھے۔ آگے، اور آگے۔ قریب، اور قریب ....!

وہ چیخ مار کر صوفے پر سے اچھل پڑا۔ سامنے کی سیٹ پر ایک انگریز
سپاہی اپنی سانولی محبوبہ سے جس نے ریشمی نیلا سایہ پہن رکھا تھا اظہارِ محبت
کر رہا تھا۔ انگریز سپاہی حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے جانی؟ ڈر گئے تھے کیا؟"

"ہاں میں واقعی ڈر گیا تھا" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کس سے؟"

"ابھی ابھی میں نے اک بھوت دیکھا تھا"

"بھوت؟ اس گاڑی میں؟" ساتھی نے پوچھا۔

"نانسنس!"

"نہیں سچ کہتا ہوں۔ بھوت تھا!"

"کس کا بھوت تھا؟" اس نے اپنی محبوبہ کی ترشی ہوئی زلفوں سے

کھیلتے ہوئے پوچھا۔

"تیسری جنگِ عظیم کا بھوت۔" اُس نے رُکتے رُکتے کہا۔

انگریز سپاہی اور اس کی سانولی محبوبہ کے چہرے فق ہو گئے۔ ڈبے میں سنّاٹا چھا گیا۔ موت کا سا سکوت، جیسے اب وہاں کوئی نہ تھا اور اسے ایسا معلوم ہوا گویا ڈبے کے کسی کونے میں کھڑا ہوا وہ بھیل ابھی تک ہنس رہا ہے!

تین غنڈے

اس کا نام عبد الصمد تھا۔ وہ بھنڈی بازار میں رہتا تھا۔ محض اسی لئے
بہت سے لوگ اسے غنڈہ کہتے تھے —— ہوگا عبد الصمد بھی غنڈہ۔ گو اس
بے چارے کو زندگی بھر یہ پتہ نہ چلا کہ وہ ایک غنڈہ ہے۔ بالعموم لوگوں کو
اپنی زندگی میں اپنے بارے میں تھوڑا بہت معلوم رہتا ہے۔ مثلاً یہ کہ لوگ
انہیں اچھا سمجھتے ہیں۔ یا بُرا۔ وہ شریف ہیں یا بدمعاش، عورتوں کو اپنی
ماں بہن سمجھتے ہیں یا اپنی ہونے والی محبوبہ، وہ دیانت دار سمجھے جاتے
ہیں یا جھوٹے۔ دروغ گو، فسادی یا امن پسند، انہیں کچھ نہ کچھ پتہ چلتا رہتا
ہے اپنے متعلق۔ لیکن بیچارے عبد الصمد کو آج تک کمر میں گولی لگنے تک

پتہ نہ چلا کہ وہ ایک غنڈہ ہے' اسے گولی کیسے لگی یہ تو میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ اس وقت میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ عبدالصمد ایک غنڈہ تھا۔ جو فائن آرٹ اینڈ پرنٹنگ ورکس میں کام کرتا تھا جو وزیر رستوراں کے قریب ایک سرخ اینٹوں والی دو منزلہ عمارت میں واقع ہے اور جس کے سامنے ٹرام کا اڈہ ہے اور جو آج کل جل کر کوئلہ ہو چکا ہے ہندوستانی اور انگریزوں کی دیرینہ رقابت کی وجہ سے' اس لڑائی میں ہندوستانیوں کی ہزاروں جانوں کا نقصان تو ہوا ہی لیکن بے چارے انگریزوں کے کئی ہزار کارتوس مفت میں پھنک گئے۔

عبدالصمد اسی فائن آرٹ پریس میں ملازم تھا لتھو کے بھاری پتھر اٹھا کے مشین پہ جماتا تھا۔ یہ اس کا کام تھا۔ دوسرے مزدور تو مشکل سے ایک پتھر ایک وقت میں اٹھا سکتے تھے۔ لیکن عبدالصمد کے کام کرنے کا انداز یہ تھا۔ کہ پان کی پیک زور سے سامنے نالی میں پھینک کے ایک موٹی سی گالی دے کے وہ بیک وقت دو پتھر اٹھا لیتا اور انہیں جانِ عزیز کی طرح سینے سے لگائے ہوئے منیجر کی میز کے پاس سے گذر کر مسکرا کر ایک آنکھ میچ کر دل ہی دل میں منیجر کو ایک موٹی سی گالی دے کر وہ دونوں پتھر مشینوں

پر جمانے کے لئے جاتا۔ اور ہنس کر مشین میں سے کہتا، لو بیٹا بھیکے اب فلفی جماؤ
مشین چلانے کو وہ فلفی جمانا کہتا تھا۔ دراصل اس کی اپنی زبان تھی جس میں
وہ زندگی کے اہم موضوعات پر گفتگو کیا کرتا۔ جب مالک پریس میں آتا تو چپکے
چپکے مزدوروں سے کہتا، شیر آیا شیر آیا دوڑنا۔ جب مالک نہ ہوتا اور منیجر
زور سے چلانے لگتا۔ تو کہتا' ام کرو۔ کرو کام سور کی اولاد۔ دیکھتے نہیں ہو
گیدڑ کی بیوی کی بیوی رو رہی ہے۔ جب تنخواہ کا دن آتا تو کہتا۔ آج بیچارے
کا چیٹم بجتا ہو گیا۔ یہ چیٹم بجتا کس زبان کا لفظ تھا۔ کہاں سے آیا تھا۔ اس نے
کہاں سے سیکھا تھا۔ اس امر کو کوئی نہیں جانتا۔ یہ عبدالصمد کی زبان تھی۔ وہ
اس کا مالک تھا اور اسے جس طرح چاہے استعمال کرتا۔ اسے کون روک
سکتا تھا۔ زبان کے سلسلے میں اسے سب سے زیادہ عبور گالیوں پر تھا میں
نے ایسا آدمی آج تک نہیں دیکھا کہ جو عبدالصمد سے بہتر گالی دے سکتا
ہو۔ تیری ماں کے دودھ میں چکم کا یکہ۔ ایسی گالی کوئی شاعر ہی دے سکتا ہے
اور گالیوں کے سلسلے میں عبدالصمد ایک شاعر تھا۔ حسن کار تھا۔ فصاحت و
بلاغت کا بادشاہ تھا۔ جب گالی دیتا تو اس کے انداز میں ایک ایسی خطابت
ہوتی اور زبان و بیان میں وہ روانی ہوتی کہ مجھے ہندوستان کے بہترین

سیاست دان یاد آجاتے جو اکثر باتیں زیادہ کرتے ہیں اور کام کم کرتے ہیں۔لیکن عبدالصمد میں یہ ایک خاص بات تھی کہ وہ باتیں بہت کرتا تھا تو کام بھی بہت اچھا کرتا تھا۔ پریس کے منیجر کو وہ اپنی بدزبانی کی وجہ سے ناپسند تھا۔لیکن کام اتنا اچھا کرتا تھا کہ وہ اسے پریس سے نکالنا نہ چاہتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے اور ممکن ہے آپ نے بھی اس کا مشاہدہ کیا ہو۔کہ جتنے غنڈے ہوتے ہیں۔کام کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔سب سے اچھے مزدور بھی غنڈے ہوتے ہیں۔ کس قدر عجیب بات ہے۔ ہے نا!

عبدالصمد ایک اچھا مزدور تھا۔ اور اگر اس میں بات بنانے۔گالی بکنے اور بلاوجہ لوگوں پہ ہنسنے کی عادت نہ ہوتی تو وہ ایک اچھا آدمی بھی ہوتا۔ ہاں وہ ہر وقت پان کھاتا تھا۔جس سے اس کے بڑے بڑے دانت اور بھی کریہہ معلوم ہوتے تھے۔گالی بکنے میں اسے وہ کمال حاصل تھا۔کہ بڑے بڑے ادیبوں کو عمر بھر کی محنت کے بعد بھی وہ طرز انشا نصیب نہیں ہوسکتا اور ہنسی، اس کی ہنسی سب سے بڑی تھی۔ پاٹ دار، گونجدار بلند و بالا ہنسی جو پریس کی تاریک عمارت اور خاص کر جس کمرے میں وہ

کام کرتا تھا۔ اس کے لئے قطعی طور پر ناموزوں تھی۔ یہ ہنسی یاد دلاتی تھی۔ پہاڑوں کی جہاں صنوبروں کے جنگل کھڑے ہیں۔ وسیع میدانوں کی جہاں میلوں تک گیہوں کے کھیت کھڑے ہیں تاروں بھری رات کی جب سب سو جاتے ہیں۔ اور رات کی رانی اس افق سے اس افق تک زلفیں پھیلائے سورج کی کرنوں کا انتظار کرتی ہے۔ یہ ہنسی جو گویا سمندر کا سینہ چیر کے نکلی تھی اور ساری دھرتی پر پھیلتی جا رہی تھی۔ انسان کی ہنسی نہیں کسی دیو کی ہنسی معلوم ہوتی تھی۔ کرخت، بُری، گندی، ابھری ہوئی، بڑھتی ہوئی یہ پریس کی محدود تاریک چار دیواری کے لئے قطعی ناموزوں تھی۔ اس پر بھی عبدالصمد اکثر ہنستا رہتا تھا۔ گالی بکتا رہتا تھا۔ اور منیجر کے سامنے لیتھو کے پتھر اٹھائے اکڑتا چلا جاتا تھا —— غنڈا!

میں نے پہلی بار اسے فائن آرٹ پریس میں دیکھا تو ایک سخت کراہیت اور نفرت کا احساس میرے دل میں پیدا ہوا۔ جے جے ہسپتال کے سٹاف کے لوگ اک "محفلِ رقص و سرود" منعقد کرنا چاہتے تھے۔ اور میں اس کنسرٹ کا پروگرام شائع کرانے کے لئے پریس میں آیا تھا۔ یہاں میں نے عبدالصمد کو پہلی بار دیکھا۔ آپ بڑے ٹھسّے سے کمر پہ ہات رکھے فرما رہے

تھے۔ "وہ لیتھو کا پتھر مجھ سے ٹوٹ گیا۔ منیجر صاحب۔"

"کیسے ٹوٹ گیا؟"

"یہ کیسے بتاؤں بس ہاتھ سے چھوٹ گیا اور دو ٹکڑے ہو گیا۔ دیکھیے اس مادر چود پتھر کو آج ہی ٹوٹنا تھا۔ دو سال ہو گئے مجھے اس حرامی پریس میں کام کرتے ہوئے۔ دیکھیے کبھی ایسی واردات نہیں ہوئی۔" یہ کہہ کر آپ نے سر کھجایا اور سر سے ایک جوں نکال کے اسے اپنے ناخنوں کی چکی میں پیستے ہوئے بولے۔ "ہٹ تیری جوں کے منہ میں سور کے کباب!"

منیجر بولا۔ "سیدھی طرح بات کرو۔"

"سیدھی طرح تو کہہ رہا ہوں۔ جناب منیجر صاحب۔ لیتھو کا پتھر ہم سے ٹوٹ گیا۔ معافی چاہیئے۔" یہ کہہ کر ہنسنے لگا۔ گویا معافی مانگنا اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کے دانت اور اس کے مسوڑھے بلکہ اس کا حلق اور تالو تک مجھے نظر آ رہا تھا۔ میں ذرا پرے ہٹ گیا۔ کیونکہ اس کے جسم سے ایک عجیب قسم کی بو آتی تھی۔ ہر غنڈے کے جسم سے بو آتی ہے زمین کی بُو، پسینے کی بُو اور پیاز کی بُو۔ اور گو اس کا جسم بدبُودار تھا۔ اس کا دل بدبودار نہیں تھا۔ جس طرح اس کی چھوٹی چھوٹی سیاہ شریر آنکھیں گھنے

ابروؤں کے نیچے چمکتی تھیں۔ اس میں کوئی بدبُو نہ تھی۔ دس تاریخ کو جب
اسے تنخواہ ملتی اور وہ مینیجر صاحب کی طرف تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھتا
ایسی نگاہیں جن میں تشکر کے علاوہ حیرت ہوتی اور ایک ایسا جذبہ جیسے وہ
نگاہ کہہ رہی ہے۔ تو مینیجر نہیں ہے تو میرا بھائی ہے۔ ہم دونوں انسان
ہیں۔ اس جذبے میں بھی کوئی بدبو نہ تھی اور اس کی مسکراہٹ، غلیظ
مسکراہٹ جس میں پریس کا پینٹ اور مشینوں کا آئیل گھلا ہوا تھا۔ اس میں
بھی کوئی بدبُو نہ تھی۔ لیکن اس کا جسم بدبودار تھا۔ اس کے مسوڑھے غلیظ
تھے۔ اس کی باہوں کے مسل پھولے ہوئے تھے۔ اور وہ گالی بکتا تھا۔ اور
ہر وقت لڑائی کے لئے آمادہ رہتا تھا۔ وہ غنڈا تھا۔ غنڈا۔ اور جب مینیجر
نے اسے اس طرح ہنستے ہوئے معافی مانگتے ہوئے دیکھا اور وہ بھی ایک
غیر آدمی کے سامنے، تو اس کے دل میں غیظ و غضب کا اک طوفان امڈ آیا
اور اس نے ہات میں لکڑی کا رول لے کر میز پر زور سے مارا اور عبدالصمد
کو بلند آواز میں گالی دے کے کہا۔ کہ وہ کبھی اس کا قصور معاف نہیں کریگا
لیتھو کا پتھر بہت مہنگا ہے۔ تمہیں معلوم نہیں ہے۔ بویریا سے آتا ہے جو
جرمنی میں واقع ہے۔ تمہیں معلوم نہیں ہے۔ اور آج کل بڑی مشکل سے

دستیاب ہوتا ہے۔ کیونکہ جرمنی کو اتحادیوں نے شکست دے دی ہے
تمہیں معلوم نہیں ہے۔ آج کل پتھر بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔

عبدالصمد نے جواب دیا "مجھے سب معلوم ہے۔ پتھر تو ہندوستان میں ہی آتے ہیں کہ ایک پوری فوج پتھر مار مار کے ہندوستان سے باہر نکالی جاسکتی ہے۔ پتھر تو ملتا ہے منیجر صاحب۔ لیکن روٹی نہیں ملتی۔ گالی کے بغیر بے عزتی کے بغیر۔ منی جر صاحب اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ گالی دینے میں آپ میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور یہ کہہ کر عبدالصمد نے جو منیجر کی ماں کے دودھ میں حکم کا یکہ پھیرنا شروع کیا تو سارے پریس والے اس کے گرد جمع ہو گئے۔ منیجر نے بڑی مشکل سے گلو خلاصی کرائی۔ عبدالصمد نے کہا "گھر رکھو اپنے پتھر۔ عبدالصمد۔ عبدالصمد ہے۔ اس کا چٹم بٹ نہیں ہوسکتا۔ پتھر ٹوٹ گیا تو ہم کیا کریں۔ اپنے چٹم چوتڑ کاٹ کے رکھ دیں پریس میں، واہ منیجر صاحب اور اُوپر سے گالی دیتے ہو۔ ہم کام نہیں کریں گے کبھی کام نہیں کریں گے۔ اس سالے پریس میں۔ ہم ابھی چلے جاتے ہیں۔ فوراً اسی وقت چلے جاتے ہیں۔" عبدالصمد دیر تک اسی طرح بکتا جھکتا رہا۔ لیکن پریس چھوڑ کے گیا نہیں۔ اس معاملے میں اس کی

سیاست انگریزوں سے ملتی جلتی ہے۔ جو ہمیشہ ہندوستان کو چھوڑ کر جانے کی دھمکی دیتے رہتے ہیں لیکن کمبخت جاتے نہیں۔ خیر وہ خود نہیں گیا، تو دوسرے روز منیجر نے پریس کے مالک سے کہہ سُن کے عبدالصمد کو وہاں سے نکلوا دیا۔ یہ فساد سے دو دن پہلے کا واقعہ ہے۔ میں نے اگلے روز عبدالصمد کو دیکھا کہ سڑکوں پر اور بھنڈی بازار کے مختلف راستوں پر اور دوسرے غنڈوں کے ساتھ مل کے شور و واویلا کرتا تھا اور ہڑتال کرا رہا تھا ایک جگہ مسٹر چندریگر جو مسلمانوں کے بہت بڑے لیڈر ہیں تقریر کر رہے تھے۔ ہمیں اس ہڑتال میں، اس فساد میں، اس جھگڑے میں کوئی حصّہ نہیں لینا چاہیئے۔ یہ سب کانگریس کی شرارت ہے۔ تو اس وقت بھی عبدالصمد اور اس کے ساتھی غنڈوں نے شور مچا کر اس امن پسند لیڈر کی ایک نہ چلنے دی اور "جے ہند" اور "ہندوستانی جہازی ہڑتال زندہ باد" کے لگا لگا کے اسے جلسے سے باہر کر دیا اور پھر میں نے سنا کہ ان لوگوں نے ہڑتال کی اور ٹرامیں اور ٹرام کے شیڈ جلا دیئے اور ان تمام کاموں میں عبدالصمد بھی شامل تھا۔ لیکن ان باتوں کا مجھے بعد میں پتہ چلا۔ چندریگر کی میٹنگ کے بعد میں نے عبدالصمد کو جے جے ہسپتال میں دیکھا۔ گولی اس کی پیٹھ میں کمر کے پاس لگی

تھی اور پیٹ پھاڑ کے باہر ہو گئی تھی۔ کمر کے پاس ایک چھوٹا سا سوراخ تھا۔ جہاں گولی اندر داخل ہوئی تھی۔ اور دوسری طرف پیٹ میں ایک بہت بڑا زخم تھا جو ہزاروں چھروں سے پیدا ہؤا تھا۔ یہ کارتوس ڈم ڈم والی گولی والا کارتوس نہ تھا جو گذشتہ غدر میں استعمال کیا گیا تھا۔ یہ ایک نیا کارتوس تھا۔ نیا اور خوفناک جو جسم کے اندر جا کے پھیل جاتا ہے۔ اور سینکڑوں چھوٹے چھوٹے زخم پیدا کر سکتا ہے۔ مارنے کو تو انسان کو یوں بھی ایک معمولی سے کارتوس سے مارا جا سکتا ہے۔ لیکن غنڈوں کے لئے اس قسم کا کارتوس ذرا اچھا رہتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ کارتوس سؤر کے شکار کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ خیر غنڈے تو سُؤر سے بدتر ہوتے ہیں۔ اچھا ہؤا عبدالصمد مر گیا۔

عبدالصمد مر گیا۔ اور اس کی لاش میرے سامنے پڑی تھی۔ عمر چھبیس سال۔ ذات راجپوت۔ مذہب مسلمان۔ غیر شادی شدہ آنکھوں کی چمک مردہ، لبوں کی ہنسی مردہ۔ زندگی بخش گالی مُردہ۔ ہر چیز کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا اور وہ میرے سامنے ہات پھیلائے، منہ کھولے۔ مردہ پڑا تھا۔ ایک طعنہ، ایک تاریک مستقبل۔ ایک خاموش گالی۔ اور اس کی ماں اپنی چھاتی دوہتڑ کوٹ رہی تھی اور بین کر رہی تھی اور ہسپتال کے باہر خیمے میں

بیٹھے ہوئے سپاہیوں کی طرف اشارہ کرکے کہہ رہی تھی۔ میرے بیٹے نے
ان ظالموں کا کیا بگاڑا تھا۔ میرا بیٹا کیوں مرگیا۔ کیوں گولی اسے لگی۔ اس نے
کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ تو گلی میں بھاگتی ہوئی ایک چھوٹی سی اینگلو انڈین
لڑکی کو بچانے کے لیئے باہر نکلا تھا۔ اور کسی نے اس کی پیٹھ میں گولی ماردی
لڑکی بچ گئی۔ لیکن میرا جوان —— ہونہار بیٹا۔ ڈاکٹر! میرا بیٹا اس جہان
میں نہیں ہے۔ وہ کیوں مارا گیا۔ ڈاکٹر خدا کے لیئے مجھے بتاؤ وہ کیوں مارا گیا۔

اس لیئے کہ وہ ایک غنڈہ تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ اور اس
کا منہ کپڑے سے ڈھک دیا اور دوسری لاش کی طرف متوجہ ہوگیا۔

دوسرے غنڈے سے میری ملاقات ایک بنیئے کے گھر پر ہوئی۔
سینڈھرسٹ روڈ جسے گنڈے سنڈا اس روڈ کہتے ہیں۔ بڑے بڑے بنیوں
کا مسکن ہے۔ یہیں پدم سی سیٹھ بھی رہتے ہیں، پدم سی سیٹھ جے جے ہسپتال
کے ڈاکٹروں میں بہت مقبول ہیں۔ کیونکہ آپ سو روپے پر ایک سو بیس روپے
سود لیتے ہیں۔ اور سارا معاملہ نہایت خاموشی سے طے کرتے ہیں۔ پدم سی
سیٹھ کا چہرہ بچوں کی طرح بھولا نظر آتا ہے۔ مسکراہٹ گھی میں چپڑی ہوئی

معلوم ہوتی ہے۔ اور لب ولہجہ میں راشن کے باوجود اتنی شکر گھلی ہوئی ہے کہ چور بازار کا شبہ ہوتا ہے۔ پدم سی سیٹھ میرے بہت اچھے دستوں میں سے ہیں۔ اس لئے کہ مجھے قرض کی اکثر حاجت رہتی ہے۔ اور جو دوست مجھے روپیہ قرض نہ دے۔ میں ذرا اسے دوست کم بناتا ہوں اور پھر پدم سی سیٹھ کوئی زیادہ سود نہیں لگاتے۔ سو روپے پر صرف ایک سو بیس روپے۔ اور پھر وہ بھی بغیر ضمانت کے۔ اب بتایئے اس سے اچھا سودا ہندوستان سے باہر کہاں ہو سکتا ہے۔ آج بھی جب میں غنڈوں سے بچتا بچاتا سینڈھرسٹ روڈ پر پدم سی سیٹھ کے مکان پر پہنچا تو انہوں نے میری بڑی آؤ بھگت کی۔ وہ مجھے کبھی نہیں ٹالتے ہمیشہ روپیہ دے دیتے ہیں۔ یہ تو انہیں معلوم ہے کہ میں جے جے ہسپتال میں ڈاکٹر ہوں۔ اور مجھے روپیہ کی ضرورت رہتی ہے۔ اور روپیہ مع سود ادا بھی کر دوں گا۔ انہیں میرے عشق کا پورا حال معلوم ہے۔ وہ اس نرس کو بھی جانتے ہیں۔ جو اس قدر خوبصورت اور مہنگی ہے۔ کہ اس کے لئے ایک کنوارے نوجوان ڈاکٹر کو ایک سو بیس روپے سیکڑہ سود دینا پڑتا ہے ہندوستان میں ایک تو عشق بہت مہنگا ہے۔ اور پھر خلافِ قانون

بھی ہے۔ سماج نے اور ریاست اور حکومت نے محبت کو خلافِ قانون قرار دے رکھا ہے۔ آپ کسی انسان کو قتل کر سکتے ہیں۔ مگر اس سے عشق نہیں کر سکتے اگر آپ کسی لڑکی سے کہنا چاہیں۔ مجھے تم سے عشق ہے۔ تو وہ فوراً جواب دیتی ہے۔ کیوں کیا تیرے گھر ماں بہن نہیں ہے۔ گویا اس ملک میں عشق صرف ماں بہن تک محدود ہے۔ اس کے بعد بھی اگر آدمی عشق کرنے کی جرأت کرے تو جوتی کھاتا ہے۔ پٹتا ہے یا گولی کا شکار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان محبت کرنے کی نہیں نفرت کرنے کی جگہ ہے۔ یہاں انسان انسان سے محبت نہیں کرتا ہے۔ نفرت کرتا ہے۔ لوگ حکومت سے، حکومت لوگوں سے ماں باپ بیٹوں سے۔ بیٹے ماں باپ سے نفرت کرتے ہیں، گھر میں، بازار میں، کارخانوں میں، دفتروں میں نفرت کا راج ہے، کانگرسی، لیگی، سوشلسٹ ایک دوسرے کو کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ انہیں جتنی نفرت ایک دوسرے سے ہے، اتنی اجنبی حکومت سے نہیں جس کے یہ سب غلام ہیں، ہندوستان ایک صحرائے نفرت ہے۔ جس میں کہیں کہیں محبت کے نخلستان نظر آتے ہیں۔ اور یہ نخلستان، نرسوں، دیہاتی لڑکیوں اور نظم نگاروں اور عدم تشدد کے حامیوں نے اگائے ہیں ۔۔۔

چاروں طرف نفرت کی ریت ہے۔ معلوم نہیں کیا وجہ ہے۔ شاید اس ملک کی آب وہوا ایسی ہے۔ بیچارے پدم سی سیٹھ بھی اسی آب وہوا میں رہتے ہیں۔ اس لئے ہر ایک آدمی سے نفرت کرتے ہیں۔ اگر اس نفرت میں کوئی شامل نہیں ہے تو وہ ان کی چھوٹی بیٹی — شانتا ہے۔ شانتا ایک پتلی دبلی ۹ سال کی گجراتی لڑکی ہے۔ جس کو خدا نے نہ خوبصورتی دی ہے نہ ذہن پتلی پتلی ٹانگیں، میلے فراک سے باہر نکلتی ہوئیں پتلی پتلی باہیں، سوکھا سامنہ جیسے پیاس کبھی بجھی ہی نہیں، ہر وقت چلاتی رہتی ہے اور منہ میں مٹھائی ٹھونستی رہتی ہے۔ اس قدر پھوہڑ، بدمذاق، بدصورت لڑکی ہے کہ معاذ اللہ دیکھ کے تسلی ہوتی ہے۔ مجھے ایک تو بچوں سے یونہی نفرت ہے۔ کمبخت جب دیکھو یوں ہی بلا سوچے سمجھے چلاتے رہتے ہیں۔ کبھی کرسی پکڑ کر ہلا رہے ہیں۔ تو کبھی آپ کا کوٹ کھینچ رہے ہیں، کبھی تھرمامیٹر پہ ہات مارتے ہیں تو کبھی دیوار پھاندنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور پھر ایسی بچی جسے ایک پل قرار نہ ہو۔ جس کی آواز بھی تیز اور کرخت ہو۔ اور جس کے لبوں سے ہر وقت جلیبی کی رال بہتی ہو۔ اور جس کا باپ مجھ سے ایک سو بیس روپے سود لیتا ہو، آپ اس لڑکی سے میری محبت اور شفقت کا اندازہ کر سکتے ہیں خیر تو

اس روز جب میں وہاں پہنچا ہوں تو شانتا کمرے میں موجود تھی اور ادھر سے اُدھر اور اس کمرے سے اس کمرے میں اچھل رہی تھی اور چلا رہی تھی اور جلیبیاں کھا رہی تھی۔ پدم سی سیٹھ نے اسے ڈانٹا اور کہا "دوسرے کمرے میں بیٹھ جا۔ دیکھتی نہیں ہے ڈاکٹر صاحب تشریف لائے ہیں"۔ تو شانتا بسورتی ہوئی اور دل ہی دل میں مجھے گالیاں دیتی ہوئی اور ڈبڈباتی نگاہوں سے مجھے گھورتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ باپ نے اسے جاتے دیکھ کر پھر کہا "اور یہاں دیکھ باہر نہ جانا بیٹا باہر دنگا ہے"۔ پھر انہوں نے بہی کھولی اور ریشم کی طرح ملائم آواز میں بولے "آپ کو کتنے روپے چاہئیں ڈاکٹر صاحب" میں نے کہا "آج تو میں اپنی آخری قسط ادا کرنے آیا ہوں۔ فی الحال مجھے روپے نہیں چاہئیں۔ کیونکہ نرس سے میری لڑائی ہو گئی ہے۔ اس لئے میرا عشق ختم سمجھئے"۔ وہ ہنسے "تو رسید کاٹ دوں"۔ میں نے کہا "ہاں لایئے میں بھی دستخط کئے دیتا ہوں"۔ چنانچہ رسید کاٹ دی گئی اور دستخط ہو گئے اور اشٹام واپس مل گیا اور پھر میں سگریٹ اور وہ بیڑی پینے لگے اور ہونے لگیں جہان بھر کی باتیں۔ روئی کا بھاؤ مندا ہے اور سونے چاندی کا دھندا ہے اور سٹاک اکسچینج گندا ہے اور گلے میں انگریزوں کا پھندا ہے۔ اور

"ہم تو ڈاکٹر صاحب رام آپ کا بھلا کرے بہت بُری طرح پھنسے ہیں۔ یہ سٹرلنگ بینس ہیں نے کہا۔ جی ہاں یہ سٹرلنگ بلینس ہی تک معاملہ رہتا تو غنیمت تھا۔ لیکن سیٹھ صاحب سٹرلنگ بلینس کی انہوں نے ایک اور شق نکالی ہے اسے Carotia Artery کہتے ہیں۔"

"کیر اٹڈ آرٹری کیا ہے؟"

"کیر اٹڈ آرٹری کے ساتھ اینٹی فی بین ہائی پو کا کاٹی جرمنی سائیڈل لگا کے ساتھ ہیں اس کو Anti Septic بھی کر دیا ہے۔ سیٹھ صاحب" باپ رے" سیٹھ صاحب چونکے "تب تو معاملہ بہت ٹیڑھا ہے۔"

میں نے کہا "جی ہاں انگریزی اخبار میں سب آیا ہے آپ نے پڑھا نہیں۔"

سیٹھ صاحب بولے "جی نہیں۔ میں تو جنم بھومی پڑھتا ہوں۔ یہ تو اچھا ہوا آپ نے بتا دیا۔ ایک تو یہ فساد شروع ہے جہازیوں نے ہڑتال کر رکھی ہے۔ غنڈہ گردی ہو رہی ہے۔ اور اُدھر سے یہ اینٹی سپٹک آپ نے بتا دیا۔ میں تو صاحب چور بازار میں جتنا روپیہ لگا رکھا ہے اب نکلواتا ہوں"

اتنا کہہ کے سیٹھ صاحب نے کروٹ بدلی۔ تو نیچے گلی میں کار ندس

دھمکے کی بار بار آواز آئی۔ بولے دیکھا آپ نے ہڑتال کرنے سے یہ ہوتا ہے۔ یہ غنڈے بدمعاش امیر لوگوں کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر جی کلجگ آگیا ہے۔ یہ غنڈے بدمعاش امیر لوگوں کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ کارخانے جلانا چاہتے ہیں۔ شہر کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر جی کلجگ آگیا ہے۔ کلجگ دھرم کا بیج نہیں۔ اس دھرتی پر۔

میں نے کہا۔ "آپ بالکل سچ کہتے ہیں۔"

اتنے میں پھر گولی چلنے کی آواز آئی اور گلی میں آہ و بکا کی صدا بلند ہوئی اور بچّوں کی چیخیں سنائی دیں۔ ہم بھاگے بھاگے کھڑکی کی طرف گئے اور نیچے جھانک کر دیکھا تو یکایک سیٹھ نے چیخ ماری اور پھر دھڑادھڑ سیڑھیاں نیچے اترنے لگے۔ میں ان کے پیچھے آرہا تھا۔ کوئی خاص بات نہ ہوئی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ گلی کے بچے پولس والوں سے آنکھ مچولی کھیلتے تھے یہ لوگ چھپ کے گلی کے دوسرے کونے میں چلے جاتے اور وہاں سے پولس والوں پر "جے ہند" کے نعرے کستے اور ان پر کنکر پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پھینکتے اور جب وہ پولس والے ان کو ڈراتے اور ان کا تعاقب کرتے تو بچے بھاگ کے ہنستے کھیلتے خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے

گلی کے دوسرے نکڑ پر جا کھڑے ہوتے اور وہاں بھی اسی طرح پولس والوں سے کھیل کھیلتے۔ بڑا دلچسپ مشغلہ تھا اور یہ بچے دن بھر اسی طرح مشغول رہتے تھے کوئی دوسرا ملک ہوتا تو ان بچوں کی یہ شرارت کھیل سے تعبیر کی جاتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ پولس کا سپاہی کسی شریر بچے کے کان کھینچ دیتا۔ دیکھ بٹیا آئندہ سے ایسا مت کیجو اور معاملہ وہیں ختم ہو جاتا۔ لیکن یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے اس ملک میں محبت نہیں نفرت کا راج ہے۔ اس لئے پولس والوں نے ملٹری کو مدد کے لئے بلا لیا۔ اور سینڈھرسٹ روڈ پر آنکھ مچولی کا وہ دلچسپ کھیل شروع ہوا جو تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ بچے جب حسب معمول چیختے چلاتے۔ کنکر پھینکتے گلی کے نکڑ پر پہنچے تو یہاں گولیوں سے ان کا استقبال کیا گیا۔ اور پھر وہ جب یہاں سے ہٹ کے دوسرے نکڑ پر پہنچے تو وہاں بھی گولیوں سے ان کی آؤ بھگت کی گئی۔ شکّر کی گولیوں سے نہیں۔ کارتوس کی گولیوں سے۔ جب بچے زخمی اور جاں بلب ہو کے وہاں سے بھاگے اور گلی کے تیسرے ناکے کی طرف چلے تو وہاں بھی آنکھ مچولی کھیلنے والے سپاہی بیٹھے تھے۔ دھڑا دھڑ گولیاں چلیں اور پھر اس کے بعد یکلخت سناٹا ہو گیا۔ چاروں طرف خاموشی۔ کھیل ختم ہو گیا تھا۔ اب جے ہند کہنے والا کوئی نہ تھا۔ سپاہی چلے گئے۔ پھر

یکایک لوگ گلی میں گھس آئے اور اپنے زخمی اور مردہ بچوں کو اٹھانے لگے اور مائیں اور بہنیں، بھائی اور باپ دھاڑیں مار مار کے رونے لگے۔ پدم سی سیٹھ نے اپنی زخمی شانتا کو اٹھا لیا اور ہم دونوں مل کے اسے اُوپر کمرے میں لے آئے۔ پدم سی دھاڑیں مار کر رو رہا تھا، شانتا! میں نے تجھ سے کہا تھا باہر نہ جانا باہر نہ جانا، کبھی نہ جانا۔ وہ طوطے کی طرح رٹ رہا تھا اور ہاتھ ملتا جا رہا تھا۔ اور وہ بدصورت گجراتی بچی "جے ہند" کہتے ہوئے مر رہی تھی اور اس کے منہ سے لہو اُبل رہا تھا۔ اس کے منہ سے اس کی باہوں سے، اس کے سینے سے لہو نکل رہا تھا۔ اس کا جسم اپنے لہو کے رنگ میں رنگا گیا۔ سرخ رنگ۔ لال اوڑھنی۔ ماتھے کا سیندور، وہ نو سال کی بچی آج بیاہی جا رہی تھی ننھی معصوم دلہن، اس رنگ نے گویا اس کی بدصورتی غائب کر دی۔ اس کا چہرہ خوبصورت تھا اس کی باہیں گول اور گداز اور چھاتی ماں کے دودھ سے بھاری، اے بن بیاہی دلہن آج تیری مانگ میں شہیدوں کا لہو ہے تیری بڑی بڑی آنکھوں میں اجڑے وطن کا سہاگ ہے۔ تیرے ترسے ہوئے لبوں پہ جے ہند کا نغمہ ہے۔ آج تو نے ملک کو اپنی زندگی کی آخری قسط ادا کر دی اور اپنے خون سے رسید لکھ کر دے دی ہے۔ اے ننھی غنڈہ لڑکی

تیری موت۔ آج ہم سب پر بھاری ہے اور میں نہیں جانتا کہ کیا کروں۔ کس طرف دیکھوں۔ کس کو بلاؤں۔ کس کو یاد کروں۔ کیوں کہ زمین پاؤں تلے سے نکلی جا رہی ہے اور تیرے وطن کے بڑے آدمیوں نے تجھ سے غداری کی ہے اور تیرا لہو انتقام کے لئے پکار رہا ہے۔

گجراتی لڑکی مر گئی۔ ایک دو سسکیاں۔ جے ہند کا مدھم ہوتا ہوا نغمہ، اور پھر اس کا خون پگھلے ہوئے یاقوت کی طرح فرش پر بکھر گیا۔ مجھے فضا کی خاموشی یاد ہے۔ جیسے ساری کائنات رو رہی ہو۔ مجھے وہ نگاہ یاد ہے۔ جیسے ہزاروں برچھیاں ایک ساتھ دل میں کھبی جا رہی ہوں۔ گجراتی لڑکی مر گئی اور اس کے ساتھ اس کا ہونے والا شوہر مر گیا اور اس کے خوبصورت بچے مر گئے۔ اور زندگی اور اس کی تخلیق اور اس کی ساری کی ساری خوبصورتی مر گئی۔

کیا ہونا چاہیئے کیا کرنا چاہیئے۔ یہ سب کچھ میں نہیں جانتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ وہ نغمہ اور وہ پکار اور وہ آہنگ جس میں اس بچی کا خون گھلا ہوا ہے، کبھی مر نہیں سکتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ جب کوئی گیت، کوئی چیخ، کوئی تبسم یوں کسی کے خون سے رچ جائے تو پھر وہ کبھی نہیں مرتا۔ وہ گلے میں پھندا بن

کے رہتا ہے۔ دل میں ناسور بن کے چبھتا ہے اور رُوح میں کانٹا بن کر کھٹکتا ہے اسے غنڈہ کہنا آسان ہے، اسے بھول جانا ممکن نہیں ہے۔

(۳)

تیسرا غنڈہ جو مجھے ملا، وہ سکھ تھا۔ وہ اپنی زندگی میں نہیں اپنی موت کے بعد مجھ سے ملا۔ اس نے ایک شلوار پہن رکھی تھی اور ایک نیلی دھاری دار قمیص اور اس کے چہرے پر گولی کے نشان کے سوا اور کوئی نشان نہ تھا۔ اس کا گندمی چہرہ خاموش تھا۔ خاموش اور ظفریاب اور اس کی چھوٹی بھوری داڑھی میں ریشم کی ملائمت تھی۔ اس کے خدوخال حسین تھے اور ذہن کی طمانیت لئے ہوئے اس کے چہرے سے مجھے جاٹوں کے وہ گاؤں یاد آ گئے جس میں دھرتی سونا اُگلتی ہے۔ جہاں سونے کی مورتیں اپنی سیاہ غزالی آنکھوں میں وحشی محبت کا خمار لئے ہوئے پنگھٹ پر کھڑے ہو کر پردیسیوں کو پانی پلاتی ہیں۔ جہاں نہر کے کنارے لانبی لانبی دریائی گھاس ہوتی ہے۔ اور نہر کے پرے گیہوں کے خوشے سرسراتے ہیں اور خوشوں سے اُوپر نیلا آسمان، ہنستا ہوا آسمان اور اُوپر اور بلند ہوتا جاتا ہے۔ ایک بھولا ہوا خواب ایک پُراسرار حقیقت، اچانک مسرت، یہ سب کچھ اس نوجوان سکھ کے چہرے

پر نظر آرہا تھا۔ اس کی قمیص کی جیب میں ایک نامکمل خط تھا۔ یہ خط اس نے
شاید صبح لکھنا شروع کیا تھا۔ پھر وہ اسے مکمل نہ کرسکا۔ کیونکہ صبح ہوگئی اور
پھر اس کی زندگی کی شام آگئی۔ اور اس کی آنکھوں کی بینائی اور اس کے
ہونٹوں کی گویائی اور اس کے ہاتھوں کی طاقت اس سے چھن گئی۔ گنڈہ
مرگیا۔ اس کا مجھے افسوس نہ تھا۔ افسوس اس خط کے نامکمل ہونے کا ہے
یہ خط گورمکھی میں تھا اس کا ترجمہ تو میں نہیں کرسکتا۔ کوئی کسی کی روح کا
ترجمہ کیسے کرسکتا ہے۔ اس لہجے کا۔ اس زبان کا۔ اس طرزِ ادا کا۔ جو
شخصیت ہے۔ پھر بھی جیسا برا بھلا مجھ سے ہوسکا۔ یہاں درج کرتا ہوں

"میری ماں جی۔ ست سری اکال۔ واہگورو کی کرپا سے میں یہاں
خیریت سے ہوں اور خیریت آپ کی واہگورو مہاراج کی کرپا سے لکھنا مجھ
کو بہت جلدی، اپنے کو ابھی کوئی ٹھکانا نہیں ملا ہے اور کوئی کام کاج
بھی ہے نہیں۔ شہر بمبئی کے بیچ میں دنگا ہے اور ہندو مسلمان ایک ہے
واہگورو کی کرپا سے فکر نہ کرنا۔ تیرا بیٹا جو ور نوکری حاصل کرے گا۔ تجھ کو
روپے بھیجے گا۔ اپنی اچھڑی بہن کی شادی کرے گا۔ اور اس بان چودسُور
کے بچے بنئے کا سود بھی دے گا۔ میری ماں جی بدکلامی پر ہم کو ماپھ کرنا۔

گلال چند بنئے کا نام لیتے ہی تیرے بیٹے کو گسّہ آ جاتا ہے۔ ادھر ابھی میں کرپال سنگھ ڈرائیور کی لاری میں سوتا ہوں اور روز صبح اس کی لاری دھوتا ہوں۔ جگجیت سنگھ کو بولنا کہ وہ بہن بنتو کا بیاہ اس جیبن یا وسے منوہر سنگھ سے نہ کرے نہیں تو اس کی جان مار دوں گا۔ جب مجھ کو نوکری ملتی ہے تو ایک دم آ کے خود بنتو کو بھگا کے لے جاؤں گا۔ میری ماں جی وہ تمہاری بہو۔ اچھی بہو بن کے خدمت کرے گی۔ اور......"

اس سے آگے خط کچھ نہیں کہتا۔ ہاں جو لوگ اس سکھ نوجوان کی لاش کو ہسپتال میں لائے تھے وہ کہتے تھے کہ اس نوجوان نے ہیری کیڈ پر اپنی جان دی ہے۔ وہ گرانٹ روڈ والے جلوس کے آگے آگے پگڑی سنبھال جٹا والا گیت گا رہا تھا اور بے فکری سے آگے بڑھ رہا تھا اور جب اسے گولی لگی جب بھی گیت گا رہا تھا اور بے فکری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اور جب اسے گولی لگی جب بھی گیت گا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کانگرس اور لیگ دونوں جماعتوں کے جھنڈے تھے۔ دائیں بائیں انہیں لہراتا ہوا وہ آگے بڑھتا گیا۔ گولیوں کی بارش ہو رہی تھی اور وہ اس خون کی بارش میں بڑھتا ہوا آگے جا رہا تھا۔ اور جب وہ گولیوں سے چھلنی ہو کر گر گیا تو

اس نے کہا یہ میری قمیص اور شلوار کسی حاجت مند کو دے دینا اور مجھے سکھ دھرم انوسار جلا دینا۔ اتنا کہہ کے اس نے جان دے دی۔ اور وہ وہیں ٹرام لائن پر مر گیا۔ اور دونوں جھنڈے اس کے خون سے سرخ ہو گئے۔ لیگ کا سبز جھنڈا اور کانگرس کا سبز سفید زعفرانی جھنڈا دونوں اس کے خون سے ایسے سرخ ہو گئے تھے کہ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ کون جھنڈا کس کا ہے اور وہ جو نہ ہندو تھا نہ مسلمان اس نے اپنا لہو دیکر دونوں جھنڈوں کو ایک کر دیا تھا۔ وہ جو ایک کسان تھا۔ گاؤں سے آیا تھا۔ اجڈ اور ان پڑھ تھا۔ غنڈہ!

میں نے اس کی شلوار اور قمیص اپنے ہسپتال کے ہری جن دھوبی کو دے دی۔ دھوبی نے وہ شلوار پہن رکھی ہے۔ نیلی قمیص اس کی بیوی پہننا چاہتی ہے۔ اس نے اسے پھر سیا ہے۔ جوڑا ہے۔ دوسرے کپڑے کے ٹکڑے لگائے ہیں اور اب یہ قمیص دھوبی کے گھر کے باہر جنگلے کی سلاخ پر پڑی جھول رہی ہے...... یہ عجیب قمیص ہے جو پنجاب سے آئی ہے جسے کسی کسان بچے کی ماں نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سیا ہے شاعر اور لوگ بڑے بڑے لوگوں کو بڑے بڑے لیڈروں کو سلام کرتے ہیں۔ میں تجھے سلام کہتا ہوں۔ اے غریب مفلوک الحال قمیص بھولی ہوئی

بسری ہوئی گالیاں کھاتی ہوئی قمیص، میں تجھے ہزار بار سلام کہتا ہوں۔
تو نے اک بھولے جاٹ کے مضبوط سینے پر گولی کھائی ہے۔ تو نے اس سے
پیار کیا ہے۔ اس کا ساتھ دیا ہے، زندگی میں اور موت میں اور اس وقت
جب اس ملک کے بڑے بڑے چاہنے والے اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے
تجھ پر ہزاروں سلام۔ اے میرے وطن کی وسیع غریبی کی طرح پھٹی پرانی
قمیص، تو نے اپنی آغوش میں ایک معصوم کاشتکار کے دل کی دھڑکنیں چھپائی
ہیں اور اب تو ایک ہریجن ماں کے دودھ کی عزت اور اس کے ننھے بیٹے
کی جان کی حفاظت کرے گی۔ انہیں بھی اپنی زندگی کی سادہ روی بخش۔
انہیں بھی اپنی دھرتی کا پیار دے، اپنی روح کا وہ صادق جذبہ کہ جس سے
ہم کنار ہو کے ہم سب بیری کیڈر پر آ کے مل جائیں۔ اسی طرح ہواہیں لہراتی
رہ۔ تو حسن اور سچائی اور نیکی کی تصویر ہے۔ تو اس آنے والے طوفان کی
تنویر ہے جب زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں اور آدمی محبت کرنے لگتے ہیں۔

(۴)

اس طرح یہ تینوں غنڈے مر گئے۔ لیکن یہ سب کچھ فساد کے دنوں
میں ہوا۔ لیکن اب وہ ہنگامہ ختم ہو چکا ہے، اب چاروں طرف سکون ہے۔

امن و اماں ہے۔ غنڈے مر چکے ہیں یا گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیئے گئے
ہیں اور اب شہر میں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ ہسپتال کے وارڈز زخمیوں اور
لاشوں سے پٹے ہوئے ہیں، اب چین ہی چین ہے۔ اب کالی رات ہے۔
خاموشی ہے۔ میں ہسپتال سے تھکا ماندہ آرہا ہوں اور نہا دھو کے کھانا
کھا کے بستر کے قریب لیمپ روشن کئے دیوان پر بیٹھا ہوں اور اخبار پڑھ
رہا ہوں۔ اخبار میں لکھا ہے۔ مسٹر اور مسز پھینسی اور مسٹر بندری گر اور مسٹر ستادان
اور دوسرے معزز شہری ایک انگریزی بحری جہاز پر مدعو کئے گئے ہیں جو ساحل
پر اس لئے لنگر انداز ہوا ہے تا کہ جہازی ہڑتالیوں کی بغاوت کا سدِ باب
کر سکے۔ مسٹر بندری گر برات کے دولہا معلوم ہوتے ہیں۔ مسٹر پھینسی نے ایک
ہلکے رنگ کی نیلی قمیص پہن رکھی ہے۔ اور مسز پھینسی کی ساری کا رنگ پگھلے
ہوئے یاقوت کی طرح ہے۔ یہاں امن اور قانون اور ترقی اور دستوری انقلاب
کے جام پیئے جا رہے ہیں اور میں اخبار پھینک دیتا ہوں اور پھر ریک سے
ایک کتاب نکال کے پڑھتا ہوں۔ انسان کی تاریخ از ایچ جی۔ ویلز اور میری
آنکھوں کے سامنے بیری کیڈ ناچنے لگتے ہیں۔ آدمی نے ہزاروں سال پہلے
بھی یہ بیری کیڈ بنائے تھے۔ ظلم اور جہالت اور گناہ کو مغلوب کرنے کے لئے

بیری کیڈ میری نگاہوں کے آگے ناچ رہے ہیں۔ بدھ، محمدؐ، مسیح..... پھر روشنی کی مشعل کا زاویہ تبدیل ہو جاتا ہے چارلس اوّل کا سر نظر آتا ہے۔ دار پر لٹکتا ہوا۔ پیرس میں گلوتین..... کمیون..... اکتوبر ..... میڈرڈ..... آج بھی بیری کیڈ کھڑے ہو رہے ہیں۔

مراکو میں..... الجیریا میں..... مصر میں..... ہندوستان میں..... انڈو چائنا میں..... انڈونیشیا میں..... یہ طوفان ہے طوفان اسے کون روکے گا..... یہ انقلاب ہے انقلاب، اسے کون چھیڑے گا۔ یہ قمیص ہے قمیص... آدمی کی قمیص۔ ہوا میں لہراتی ہوتی۔ اسے گولیوں سے چھلنی کر دو۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ اسے بموں اور ٹینکوں سے اڑا دو۔ یہ پھر ثابت و سالم ہو جائے گی۔ یہ قمیص مر نہیں سکتی۔ یہ آدمی کی روح ہے!